www.ma-elibrary.blogspot.com

کرشن چندر کے بہترین افسانے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

فہرست

میں اور کرشن چندر	۴
کرشن چندر کی افسانہ نگاری	۵
خمیازہ	۳۳
بھگت رام	۴۲
کچرا بابا	۵۸
ایرانی پلاؤ	۷۲
گرجن کی ایک شام	۸۵
پالنا	۱۰۹
یرقان	۱۲۲
ٹوٹے ہوئے تارے	۱۳۸
اندھیرے کا ساتھی	۱۵۱
سابجے کا مُردہ	۱۶۵
پاگل پاگل	۱۸۳
مہالکشمی کا پُل	۱۹۲
پیاسا	۲۱۲

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں اور کرشن چندر

یادش بخیر جب میرے ابا جان چوہدری برکت علی زندہ تھے تو مکتبۂ اُردو اور "ادبِ لطیف" کے دفتر میں ہر وقت ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ ماہرینِ تعلیم، اُدبا اور سیاسی رہنماؤں سے صبح و شام ایک ایسی رونق رہتی تھی جو آج ایک سُہانا خواب معلوم ہوتی ہے۔

ادیبوں میں جو صاحب بلاناغہ ادبِ لطیف کے دفتر میں آتے تھے وہ کرشن چندر تھے۔ میرا بچپن کا دور تھا مگر ہر وقت ادیبوں کے پاس بیٹھنے سے دل و دماغ میں اچھا خاصا ادبی ذوق پیدا ہو گیا تھا اور میں کم و بیش ہر صاحبِ قلم کو پہچانتا تھا۔ کرشن چندر تو میرے دوست بن گئے تھے۔ جب میرزا ادیب ایڈیٹر "ادبِ لطیف" دفتر میں نہیں ہوتے تھے تو وہ مجھ سے باتیں کیا کرتے تھے، ان کی باتوں میں بڑی مٹھاس ہوتی تھی اور میں ان کی گفتگو انتہائی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ ان کی باتیں آج بھی یاد ہیں اور یاد رہیں گی۔

کرشن چندر مجھے کبھی نہیں بھول سکتے اور میں آج ان کے منتخب افسانوں کا مجموعہ شائع کر کے وہ فریضہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو ان کی محبت کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔

یہ کرشن چندر کے بہترین افسانے سمجھے جاتے ہیں جن میں نے اور پروفیسر اختر جعفری نے ان کا انتخاب کیا ہے۔ اور میں بڑی توقع کے ساتھ انھیں کرشن چندر کے عقیدت مندوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

محمد خالد چودھری

کرشن چندر کی افسانہ نگاری

جدید اردو افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم نے جہاں بے شمار پرانی اقدار اور بوسیدہ خیالات کو بدل کر رکھ دیا۔ وہاں افسانہ نگاری کی صنف پر بھی اپنے گہرے تاثرات چھوڑے۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کا درمیانی وقفہ ایک ایسی عارضی خاموشی اور سکون و سکوت کا زمانہ تھا جو تخلیقی اور تحقیقی کاموں کے لیے خصوصاً مناسب ہوتا ہے اس مختصر سے عرصہ میں نہ صرف سائنس کی دنیا میں نئی نئی حیرت انگیز ایجادات معرضِ وجود میں آئیں بلکہ ادب آرٹ میں بھی گہری فکری اور بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عموماً جنگ کا ماحصل تباہی و بربادی، اقتصادی بدحالی اور اخلاقی پستی ہوا کرتا ہے چنانچہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم نے نہ صرف دنیا کے سیاسی نقشے میں رد و بدل کیا بلکہ ادب کے طرزِ فکر میں بھی ہلچل مچا دی۔ چنانچہ ادب نے کائناتی ہمہ گیری اختیار کرتے ہوئے روحِ ملکی انسانیت کی نمائندگی اور عکاسی کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا۔ اس دور کی ادبی تخلیقات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ عالمگیر نے ادب کو محض محلاتی اور شاہی لونڈی نہیں رہنے دیا بلکہ اُسے عوام کے گھروں کا آئینہ بنا دیا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

خاص کر اُردو افسانہ نے اس دور میں عظیم الشان تبدیلیاں دیکھیں اور انیسویں و بیسویں صدی کے سنگم کا زمانہ بالخصوص اہم ہے۔ کیونکہ اس دور میں اردو ادب نے یورپی ادب سے بے حد استفادہ کیا۔ ذرائع آمد و رفت میں سہولتیں مہیا ہونے اور مشرق و مغرب میں گہرا رابطہ قائم ہونے سے مغربی ادب جو اس وقت ارتقائی منازل نہایت سرعت سے طے کر رہا تھا مشرقی ادیبوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یورپ خصوصاً روس۔ جرمنی۔ فرانس اور انگلستان میں افسانہ نگاری ایک خاص تکنیک اختیار کر چکی تھی اور ادب کی مقبول عام صنف تصور کی جاتی تھی۔ افسانوی ادب کے بانی مبانی اور اس صنف کے لیے ادبی دنیا میں بلند مقام پیدا کرنے والوں میں پشکن۔ گورکی۔ چیخوف۔ ٹالسٹائی۔ موپاساں۔ ماحم اور ویلز کا نام قابل ذکر ہے افسانہ نگاری ایک مخصوص فن کی حیثیت سے روس سے شروع ہوئی اور فرانس اور جرمنی کا دودھ پی کر جوان ہوئی اور انگریزی زبان نے اسے خوب بنایا سنوارا۔

چنانچہ انگریزی کے توسط سے اُردو زبان سے روشناس ہوئی کیونکہ قوموں کے باہمی اختلاط سے ادب اور آرٹ کا متاثر ہونا لازمی امر ہوتا ہے لہذا انیسویں صدی میں جب ہندوستان انگریزی ادب سے روشناس ہوا تو اردو ادب نے بھی ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اگرچہ اردو ادب میں بھی کہانی کہنے اور لکھنے کی روایات موجود تھیں۔ لیکن وہ کسی طرح بھی جدید افسانہ کے معیار کے مطابق نہ تھیں۔ اُس دور کی کہانی یا قصہ میں واضح پلاٹ۔ زندہ کردار، واقعات کی ہم آہنگی انفرادیت۔ تشویش۔ اور ٹھوس نظریات بالکل مفقود تھے۔ اس میں تجمل شاہی زیادہ اور عوامیت قطعاً نہ تھی مثلاً پنج تنتر یا قصہ چہار درویش۔ طوطا مینا کی کہانی۔ کو ہم کسی طرح بھی افسانے نہیں کہہ سکتے۔ اگر ہم قصہ چہار درویش میں سے چار یا پانچ حصے الگ کر لیں اور ان کو افسانے کی شکل میں پیش کریں یا فسانہ آزاد میں سے کوئی ٹکڑا نکال لیں اور اس کو

افسانے کا روپ دے دیں جیسے کہ "رنگے سیار" کو اکثر پیش کیا گیا ہے تو کہانی کے بنیادی عنصر کی وجہ سے انہیں قصہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ مختصر افسانے نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ افسانے کے جملہ تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ان میں عام زندگی کی تصویر کشی ہے۔ بلکہ مافوق الفطرت عناصر کا بیان شد و مد سے ہے۔

جہاں تک اردو میں مختصر افسانے کا تعلق ہے۔ وہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمیں دو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں۔ ایک سجاد حیدر یلدرم اور دوسرے پریم چند ——— دونوں کی افسانہ نگاری کی ابتدا کم و بیش ایک ہی زمانے سے ہوتی ہے۔ پریم چند نے سب سے پہلا افسانہ ۱۹۰۵ء میں لکھا جس کا عنوان "دنیا کا سب سے انمول رتن" ہے یہ افسانہ اگرچہ مغربی افسانہ کا ایک تاثر ہے۔ لیکن افسانہ کی ساری فضا ہندی ہے۔ اسی طرح سجاد حیدر یلدرم نے بھی مغربی ادب اور ترکی افسانہ نویسی کا دقیق مطالعہ کرنے کی وجہ سے بعض ترجمے پیش کیے اور بعض افسانے لکھے جس طرح انگریزی زبان کو واشنگٹن ارونگ اور ایڈگر ایلن پو جیسے عظیم فن کار مل گئے تھے اور انہوں نے فن کو ہاتھ میں لیتے ہی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح اردو زبان کو بھی سجاد حیدر یلدرم اور منشی پریم چند جیسے دو اچھے فنکار ابتدا ہی میں مل گئے۔ دونوں نے ہی اپنے خلوص اور محنت سے اُردو افسانے کو بہت جلد ارتقا کی منازل پر پہنچا دیا۔ اور اس میں ضروریات کے مطابق اضافے کیے پریم چند نے دیہات کی سماجی زندگی مصوری کو اپنے لیے منتخب کر لیا اور اس فن میں وہ اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے کہ آج افسانے کی بے حد ترقی کے باوجود کوئی افسانہ نگار اُن کے درجے تک نہ پہنچ سکا۔ سجاد حیدر یلدرم نے رومانیت کی فضا میں کھو جانا پسند کیا۔ اور اس فضا میں انہوں نے ایسے کرشمے دکھانے اور ایسی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

مشعلیں روشن کیں کہ جدید افسانہ نگار ان ہی مشعلوں کی روشنی میں ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ اگرچہ اب اُن کی اپنی قندیلوں کی روشنی خاصی ہے لیکن یہ سب کی سب سجاد حیدر یلدرم کی مشعلوں سے روشن ہوئی ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے ایک اور ہم عصر سلطان حیدر جوش نے اگرچہ اصلاحی افسانے لکھے ہیں۔ لیکن اُن پر سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت کا بھی گہرا اثر ہے۔ ان کے بعد نیاز فتحپوری تو یلدرم کے خاص مقلد دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانے بھی رومانیت کے علمبردار ہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں اس رومانیت کی تکمیل اور افسانہ نگاری کے فن کی پختگی ہمیں کرشن چندر کے ہاں ملتی ہے جنہوں نے افسانہ کو جدید تقاضوں کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ اور نئے تجربات کر کے اُس کے دامن کو وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی جدت پسندی، خلوص اور طبیعت کی اپج سے اُردو افسانے میں وہ دل فریبی اور دلآویزی پیدا کی ہے کہ فن کی دنیا میں ہر صاحبِ نظر نے اُن کی عظمت اور فن کاری کو تسلیم کیا ہے۔ کرشن چندر کے حساس اور دردمند دل نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو فن کا لطیف پیکر دے کر اس میں بے حد تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر نے اپنے فن کی اساس خلوص پر قائم کی ہے۔ اسی لیے اُن کے اور اُن کے قاری کے درمیان انتہائی قربت اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دلچسپی اور توازن اور بات کہنے کے حسین انداز سے قاری کے دل کو موہ لیتے ہیں۔ کرشن چندر کی مقبولیت اور کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ ان کے فن میں خلوص کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے اور یہیں سے اُن کے فن کی عظمت شروع ہوتی ہے۔

دیگر اصنافِ ادب کی طرح افسانے کی بھی ایک خاص تکنیک ہوتی ہے۔ اس میں واقعہ، ایک کردار اور ایک وحدت کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ ان سب کے علاوہ افسانہ اس تاثیر کی شدت کا بھی متقاضی ہے جو داستانوں

میں سرے سے مفقود ہوتی ہے۔ کیونکہ افسانے میں فن کار کا ذاتی نقطۂ نظر، زبان و بیان، نظریات، تخیلات و تصورات کو بھی خاصا دخل ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں کو وہ جس مخصوص طریقے سے باہم ملاتا ہے اور ایک افسانے کے سانچے میں ڈھالتا ہے اسے فن کی اصطلاح میں اسلوب کہا جاتا ہے۔ کرشن چندر کا اسلوبِ بیان ایسا شگفتہ اور بے ساختہ اور دلآویز ہے کہ اس پر بڑے بڑے چوٹی کے فن کار بھی رشک کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایسی بے ساختگی اور شعریت ہے کہ قاری کے دل و دماغ پر ایک نغمگی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کا ایک ایک جملہ جو بظاہر سادہ ہوتا ہے مگر پُر مطلب اور موزوں ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اُن کے ہاں محاورے کے چٹخارے اور روزمرہ کی کمی ہے۔ لیکن اس کی بجائے بیان کی بہت سی خوبیاں ان کے اسلوب میں شامل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک بجائے خود الفاظ کے حُسن اور بندشوں کی نزاکت اور مطالب کی گہرائی کے لحاظ سے ایک عظیم درجہ رکھتی ہے۔ بعض مرتبہ وہ ایک سیدھی سی بات کو ایسے انداز میں کہتے ہیں کہ اس میں افسانوی فضا خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً "سفید پھول" افسانے میں وہ نینا اور گونگے کبالہ کی پہلی ملاقات کے متعلق لکھتے ہیں۔

جس دن نینا راستہ بھول کر کبالہ کے دل میں اُتر آئی تھی۔ اس دن سے کبالہ کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے زمین کے سوئے ہوئے سب سپنے جاگ اٹھے ہوں۔ چنڈر کے خلد زاروں میں ایک نئی رعنائی اور دلکشی آ گئی ہے اس کی روح میں خوشی و غم کی صدیاں بھیلے بھیلے ایک دوسرے سے مل گئی تھیں —— شاید —— اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ اگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اس مختصر سی عبارت میں کس قدر حسن ہے اور ہر فقرہ کی بندش کیسی چُست اور عمدہ ہے۔ پھر ایک گونگے کی دلی کیفیت کا نقشہ کتنے مؤثر پیرائے میں کھینچا ہے۔ اور اس کی نفسیات کا بھرپور تاثر دیا ہے خاص کر یہ جملہ کس قدر افسانوی فضا سے بھرپور ہے "کہ دنیا کا راستہ بھول کر کبلا کے دل میں اُتر آنا"۔ یہ جملہ نزاکت بیان اور حقیقت نگاری کا کیسا دلآویز حسین امتزاج ہے اور عاشق کی روح میں محبت کی حدّت اور بے بسی کے غم کی حدوں کا باہم مل جانا ایک نادر نفسیاتی واقعہ کا کس قدر کامیاب اظہار ہے یہ عام اور سیدھی سیدھی باتوں کو انداز بیان سے دلفریب اور پُرلطف بنانا صرف کرشن چندر سے ہی مخصوص ہے۔ ان کے افسانوں کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ بات کو دلفریب اور حسین بنانے کا فن پوری طرح جانتے ہیں۔ اسی طرح ذیل کی عبارت میں ایک لڑکی ریشماں کا مرقع ملاحظہ فرمایئے جو عبارت کے لحاظ سے بھی ایک فن پارہ ہے:

"ریشماں کے نازک لب شرمسار محبوب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پشیماں ہو۔ اس کے نازک ہاتھ مرمریں انگلیوں کی پوریں۔ جنگلی گلاب کی طرح حسین اس کی چال جیسے دوشیزہ بہار۔ اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لیے ہوئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی بنسری کی طرح میٹھی اور اُبلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوچ دار اور اس کا قد فارسی کا شعر تھا۔"

اس عبارت میں ایسی دلآویز تشبیہات اور استعارے استعمال کیے گئے ہیں کہ عبارت ایک حسین مرقع بن گئی ہے اور اس میں اس قدر ادبی چاشنی اور حسن پیدا ہوگیا ہے کہ کوئی بھی قاری پڑھنے کے بعد مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر کو فطرت سے جذباتی اور ذہنی لگاؤ ہے وہ چمن زاروں۔ کشمیر کے شاداب مرغزاروں اور پہاڑوں۔ قدرتی جھرنوں اور چشموں سے اس قدر متاثر ہیں۔ کہ الفاظ میں ان کی تصاویر کھینچنے کے بعد بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ تو پھر انہیں استعاروں اور تشبیہوں میں بھی استعمال کرتے ہیں اور ان تشبیہات سے افسانے کی فضا کو معمور اور مسحور کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ بلکہ ایسی جگہوں پر اُن کا فن نکھرتا ہوا اور ان کا اسلوب بیان پختہ دکھائی دیتا ہے۔

کرشن چندر کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے وہ اپنے مطلب کو الفاظ کی پیچیدگیوں میں نہیں الجھاتے اور نہ ہی ثقیل تراکیب کے استعمال سے عبارت کو بوجھل بناتے ہیں بلکہ نہایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتے ہیں جو اظہار مطالب اور افسانے کے موضوع کے عین مطابق ہوتی ہے اگرچہ وہ جابجا تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ مگر ان کی دروبست اور نشست و برخاست میں بدرجہ اتم سادگی ہوتی ہے۔ وہ عام بول چال کی زبان میں اپنی جدت طبع کی وجہ سے نئی نئی باتیں پیدا کرتے جاتے ہیں لیکن سب واقعات اور حالات کے مطابق خود بخود آتی جاتی ہیں کسی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کی تحریر میں بلا کی روانی اور غضب کی سلاست ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال ملاحظہ ہو:

"بدصورت عورت نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور پھر سر جھکا لیا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا۔ دو دفعہ۔ ایک دفعہ بدصورت عورت کو دیکھ کر اور آخری بار لڑکی کو دیکھ کر، لڑکی نے میری طرف مبہم، خمار آلود، اندوہگیں نگاہوں سے دیکھا۔ وہ نگاہیں شاید کچھ سرِ دل کا راز دینا چاہتی تھیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک بھی پیدا ہوئی۔ مگر پھر فوراً ہی گم ہو گئی۔ جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے۔"

اس عبارت میں اس قدر روانی اور بے ساختگی ہے کہ کہیں بھی ذہنی کاوش اور آورد کا پتہ نہیں ملتا۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو کرشن چندر کو دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

کہانی کا ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے مصنف کو تدرے تجربات و مشاہدات اور تدرے تخیلات سے کام لینا پڑتا ہے۔ جب یہ ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے تو پھر اُسے نقطۂ آغاز یعنی تمہید پر غور و خوض کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اچھی تمہید ہی افسانے کی کامیابی کی پہلی منزل ہے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہوتا ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعے آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضہ میں آ جاتا ہے۔ اسی لیے تمہید میں فن کار کی فنی صلاحیتوں کا صحیح امتحان ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ وہ ابتدائی منزل ہوتی ہے۔ جہاں سے قاری اُس کے گہرے تاثر سے آگے بڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اگر افسانہ نگار نے ابتدا میں ہی ایک اُلجھن یا کشمکش پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے قاری کو متاثر کر لیا ہے اور اُسے اپنے ساتھ مشکل سے مشکل راستے پر چلنے پر آمادہ کر لیا ہے اُردو میں اب تک عموماً ابتدا کے لیے تمہید کا طریقہ رائج تھا۔ مگر رفتہ رفتہ بیانیہ ابتدائیں شروع ہوئیں۔ پہلے افسانہ نگار افسانے کا حصہ بیان کرنے یا افسانے کے افراد کو ہمارے سامنے پیش کرنے سے پہلے کچھ تمہید کے طور پر بیان کرتے تھے۔ یہ تمہیدیں اکثر و بیشتر منظر کشی ہوتی تھیں کرشن چندر کے ہاں بھی شروع کے افسانوں میں ایسی تمہیدیں ملتی ہیں۔ مثلاً اُن کے افسانوں کا مجموعہ "طلسم خیال" میں ایک افسانہ "تالاب کی حسینہ"

جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

"پہاڑی کے اوپر تالاب تھا۔ یہاں سے شہر کا منظر بہت دلفریب معلوم ہوتا۔ چھوٹا سا خوبصورت کوہستانی شہر، اس کے مکانوں چھتیں ٹین کی بنی ہوئی تھیں۔ جو دھوپ میں چاندنی کے تختوں کی طرح چمکتی ہوئیں شوالوں کے رنگین اور روپہلی کلس، سڑکیں جن پر اودے رنگ کی بجری بچھی ہوئی تھی اور جن کے گرد و رویہ شمشاد اور سرو کے درخت ایستادہ تھے اس کے باغات جو آڑو بلم اور خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان سب نے مل کر اس چھوٹی سی وادی کے حسن کو فروزاں تر کر دیا تھا۔ شمال مغرب کے سلسلہ ہائے کوہ پر ایک ہلکی لطیف سی دھند چھائی تھی صنوبر، کاؤ اور دیودار کے گھنے درخت اسی سپید دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے قدموں میں یوکلپٹس کے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ ایک لمبے سے کھیپ پر سایہ کر رہا تھا۔"

اس تمہید کے پڑھتے ہی ہمارے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس تالاب میں کیا خصوصیت ہوگی جو پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ یقیناً وہ کسی جھیل سے کم خوبصورت نہ ہوگا۔ پھر وہ مندروں کے کلس ——— سڑکوں پر بچھی ہوئی اودھی بجری پہاڑی صنوبر کے درخت۔ یہ تمام چیزیں ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہیں۔ اور ہمیں افسانہ پڑھنے کے لیے اُکساتی ہیں۔ یہی بات جو قاری کو افسانہ پڑھنے اور آگے بڑھنے کے لیے راغب کرتی ہے اور یہ افسانہ نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اسی طرح افسانوں کے ایک مجموعہ "ان داتا" کے ایک افسانے "شمع کے سامنے" کی تمہید ملاحظہ فرمائیے:۔

"میرا گاؤں ابھی دس کوس دُور تھا۔ سہ پہر کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ خچر کے قدم سُست پڑ گئے تھے اور ڈھلوان پگڈنڈی کے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

دور دیر سنبلو، بناتھ اور جھینگر کی جھاڑیوں میں مُیڑوں، بنیوں اور زرّت چڑیوں نے سرکنا۔ پھدکنا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا کہیں کہیں کوئی جھینگر خوش الحانی سے پکار اٹھتا اور پھر ایک دم چُپ ہو جاتا۔ شاید اُس نے بھی سہ پہر کی گھٹتی ہوئی دھوپ اور مٹتی ہوئی حدّت میں شام کے سہانے خنک آمیز مُعطر سانس کو چھو لیا تھا۔ اور اسی لیے بے قرار ہو کر چیخ رہا تھا۔ پھر وہ یکایک چُپ ہو جاتا۔ جیسے اُسے ابھی شام کی آمد کا یقین نہیں ہے۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں شاید شام ابھی نہیں آئے گی۔ پھر کہیں سے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا اُس کے قریب سے گزر جاتا اور اُسے اپنے محبوب کی آمد کا یقین ہو جاتا۔"

اس تمہید میں بھی منظر نگاری کی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ تشویش (SUSPNCE) کا عنصر پیدا کیا ہے کہ دن ڈھل چکا ہے اور شام ہو رہی ہے۔ مگر مسافر نے ابھی دس کوس کی مسافت طے کرنی ہے۔ یہ بات قاری کو سوچنے پر راغب کرتی ہے کہ کیا وہ مسافر رات سے پہلے پہلے دس کوس کی مسافت طے کرے گا۔ اگر نہیں تو پھر آگے کیا واقعہ یا حادثہ آئندہ پیش آئے گا؟ ایسی تمہیدیں قاری کو آگے بڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہیں اور یہی کامیاب افسانہ نگاری کا پہلا زینہ ہے۔

رفتہ رفتہ منظر نگاری کا رواج ختم ہوتا گیا۔ پھر انگریزی افسانوں کی تقلید میں اُردو افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں کا آغاز کسی کردار کے تعارف سے شروع کیا۔ اور یوں پڑھنے والے کے دل میں یہ فوراً جاننے کا شوق پیدا ہونے لگا کہ یہ کردار کیسا ہے اور آئندہ وہ کیا کرتا ہے یا اس کے ساتھ کیا حالات پیش آتے ہیں؟ کرشن چندر نے بعد کے افسانوں میں اس طرح کی

تمہید سے کام لیا ہے۔ وہ کبھی مرکزی کردار کا تعارف شروع میں کراتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی ذیلی مگر دلچسپ کردار کے تعارف سے افسانہ شروع کرتے ہیں۔ مثلاً "ٹوٹے ہوئے تارے" کے مجموعہ میں "سیما" افسانے کی تمہید یوں ہے:

"اسے سوچنے اور غور کرنے کی بہت بُری عادت تھی۔ یونہی بیٹھا بیٹھا جہاں بھر کی باتیں سوچا کرتا۔ گو وہ ابھی بمشکل سولہ سال کا ہوگا اور کالج کے پہلے سال میں تھا۔ لیکن ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے اور اکثر اُلجھے ہوئے ہوتے تھے پتلون گھٹنوں کے قریب آگے بڑھی ہوئی اور کوٹ کی بانہیں کہنیوں کے قریب بے حد میلی اور گھسی ہوئی جیسے وہ ان سے اپنی انگلیوں کا کام لیتا رہا ہو۔ وہ بے حد شرمیلا لڑکا تھا شرم، جھجک اور ڈر یہ تینوں اوصاف اس میں تھے (یعنی اگر انہیں اوصاف کہا جا سکتا ہے تو)، یونہی ایک بے معنی فضول سا ڈر۔ کالج کے لڑکوں سے پروفیسروں سے۔ راہ چلتے ہوئے خوش پوش لوگوں سے۔ اسے ڈر محسوس ہوتا"

کرشن چندر نے اس لڑکے کا تعارف تمہید میں کچھ اس طرح کرایا ہے کہ قاری کا دل خود بخود چاہتا ہے کہ افسانہ آگے بڑھے۔ آخر اس لڑکے کو سوچنے کی عادت کیوں تھی اور وہ ہر وقت کیا سوچتا رہتا تھا۔ انگلش میں پو (POE) نے ایسی کہانیاں لکھیں جن کا آغاز عموماً حیرت انگیز جملوں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بات اُس سے پہلے شیکسپیئر کے ڈراموں میں بھی موجود تھی۔ لیکن "پو" نے اس فن کو خاص انداز میں اپنایا اور اس میں اچنبھا پن پیدا کیا۔ اسی طرح برٹ ہارٹ (SERT HARTE) بھی اپنی کہانیوں کی تمہید حیرت انگیز جملوں سے باندھتا ہے چنانچہ یہ رواج رفتہ رفتہ اردو میں بھی ہو گیا۔ دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح کرشن چندر نے بھی اس نئی تکنیک سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اُن کے بھی اکثر و بیشتر افسانے ایسی تمہیدوں کے حامل

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ہیں۔ جن میں یا تو کوئی ایسا حیرت افزا جملہ ہوتا ہے جو فوراً قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیتا ہے یا پھر کوئی ایسا دل چسپ مکالمہ ہوتا ہے جس کے سنتے ہی قاری چونک پڑتا ہے۔ اور افسانہ پڑھنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ مثلاً اُن کا ایک افسانہ "ماں" ہے جو "طلسم خیال" میں شامل ہے۔ اس کی تمہید یوں ہے:

کیوں امی؟ میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

کیوں امی ——؟ اماں نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان میرے سوال کو غصّے سے دُہراتے ہوئے کہا —— شرم نہیں آتی" باپ کو بھی اور بیٹے بھی۔ اتنے بڑے ہوگئے ہو۔ کچھ خدا کا بھی خوف نہیں"

اس تمہید کے پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ پھر کیا ہوا —— ؟ اس کی ماں کیوں رو رہی تھی —— ؟ پھر اس کی ماں کیا کہنا چاہتی تھی —— ؟

غرض کرشن چندر نے تمہید کے ہر طریقہ اور فن سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرہی لیتے ہیں اور آگے پورا افسانہ پڑھنے کے لیے ہر طرح سے تیار کر لیتے ہیں اُن کا تقریباً ہر افسانہ اس اعتبار سے جاذبِ نظر اور قابلِ توجہ ہوتا ہے کہ اس کی تمہید نہایت دل کش دل فریب ہوتی ہے اور قاری کے ذہن پر گہرا نقش ثبت کر دیتی ہے۔

کرشن چندر کی تمہیدوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع کی نوعیت کو سمجھ کر ہی تمہید کا آغاز کرتے ہیں اور پھر افسانے کے موضوع کے مطابق اُسی طرح کا لب ولہجہ اور اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ افسانے کے پہلے قدم پر ہی فنکارانہ صلاحیتوں کا یقین دلانا شروع کر دیتے ہیں۔

افسانے کی تمہید کے بعد واقعات اور حقائق مختلف منزلوں سے گزر کر آہستہ آہستہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتے ہیں۔ اور بالآخر وہ مقام آجاتا ہے جسے انجام

یا خاتمہ کہتے ہیں۔ تمہید اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ قاری کے لیے دل چسپی کا سامان یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ افسانے کا درمیانی حصّہ اس لیے خوبصورت اور دل چسپ ہونا ضروری ہے کہ قصّے کا اصل حُسن اور واقعات اس مقام پر اپنے منتہا اور نقطۂ عروج پر پہنچتے ہیں اور خاتمے کی دلچسپی اس لیے فنّی طور پر لازم اور ضروری ہے کہ جو دلچسپی آخر تک آتے آتے قاری کو اپنے ساتھ لاتی ہے وہ آخر میں ختم نہ ہوجائے یا کسی طرح کم نہ ہوجائے اور پھر افسانے کے اختتام کا اثر قاری کے ذہن پر خاصا دیرپا ہوتا ہے۔ اگر انجام اچھا ہوگا تو قاری افسانے سے اچھا تاثر قبول کرے گا۔ اور اگر انجام اچھا نہیں ہوگا۔ تو وہ دلچسپی جو افسانے کے آغاز میں قائم کی تھی اور جس نے قاری کو آگے پڑھنے پر مجبور کیا تھا وہ یکسر ختم ہوجائے گی۔ افسانہ پھیکا ہو کر رہ جائے گا۔ اور قاری اس سے اچھا تاثر قبول نہیں کرے گا۔ اس طرح افسانہ نگار کی تمہید پر کی ہوئی محنت رائیگاں چلی جائے گی۔

اسی لیے اچھے فن کار کے ہاں عموماً انجام پختہ اور مؤثر ملتا ہے کیونکہ وہ اپنی پوری توجہ اختتام پر صرف کر دیتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والا نقطۂ عروج سے نقطۂ اختتام تک کسی طرح کی بے تعلقی محسوس نہ کرے۔ کرشن چندر اس مقام پر بھی اپنے فنی منصب کو کبھی نہیں بھولتے۔ بلکہ اُسی طرح استعمال کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں ابتدا سے جو نقش قائم ہوچکا ہے۔ وہ ڈھیلا اور بے رنگ نہ ہوجائے۔ جس طرح اُن کی تمہید انتہائی دل کش ہوتی ہے تو درمیانی حصّہ انتہائی مربوط اور منطقی ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح انجام نہایت زوردار اور پُر تاثیر ہوتا ہے۔ مثلاً "اندھا چھترپتی" افسانے کا انجام کچھ ایسے دردناک پیرائے میں ہے کہ افسانہ ختم کرتے ہی قاری کے دل پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

چند دن اور گزر گئے اور میں نے سُنا کہ اندھا چھترپتی مر گیا۔ اس کی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

لاش شہر سے باہر دو ایک سڑک کے کنارے پائی گئی — کہتے ہیں کہ اس کے گھٹنے کے زخم میں زہر پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

شام کے دھندلکے سے پہلے سیوا ستی والوں نے اس کی لاش کو ایک میلی سی دھوتی میں لپیٹ کر نذرِ آتش کر دیا —"

اسی طرح ایک افسانہ " صرف ایک آنہ " کا انجام ملاحظہ فرمائیے جو طلسم خیال میں شامل ہے:۔

" پولیس سارجنٹ نے مان سنگھ کو مدد کے لیے کہا۔ مان سنگھ اور پولیس سارجنٹ دونوں نے مل کر اس آدمی کو ٹیکسی میں لٹا دیا۔ جب مان سنگھ نے بیہوش آدمی کا جسم ایک لمبی سیٹ پر رکھا اور اس کی بھینچی ہوئی مٹھیوں کو ٹھیک کیا تو اس نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی گھٹی ہوئی ہتھیلی میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دبی پڑی ہے اس نے جھک کر غور سے دیکھا۔ یہ ایک آنہ تھا — !

اس افسانے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا انجام وہاں پر ہوتا ہے۔ جہاں افسانے کا نقطۂ عروج ہے۔ یعنی قاری کو نقطۂ عروج سے انجام تک پہنچنے میں کسی طرح کی کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ رفتہ رفتہ انجام کے پردے اس کی نگاہوں سے ہٹتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ انجام کی منزل اسے صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا انجام المیہ ہے اور ایک ایسے مقام پر افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔ جس سے آگے اور کچھ نہیں ہے کرشن چندر کے کافی افسانے ایسے ہیں جن کا انجام المیہ اور حزنیہ ہے۔ اور جن کے اختتام پر قاری کے دل و دماغ پر گہری دھند چھا جاتی ہے اور رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر اپنے قارئین کے جذبات سے کھیلنے کا فن اچھی طرح جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ کس طرح قاری کے جذبات میں ہلچل پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور کیسے ان جذبات میں ٹھنڈک داخل کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس طرح چاہتے ہیں۔ قاری کو اپنے ساتھ بھگا لے لیے پھرتے ہیں۔ ان کے بعض افسانے ایسے الفاظ یا فقرات پر ختم ہوتے ہیں کہ قاری اس سے آگے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ایسے افسانے کے کئی ایک انجام سوچے جا سکتے ہیں اور افسانہ ختم ہونے پر ہر شخص بساط کے مطابق اس کا انجام سوچتا ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق اپنے تصور سے انجام کو مکمل کرتا ہے۔

اسی طرح کا ایک انجام ملاحظہ ہو۔

" اور جب انسپکٹر نے وصیت نامہ کھولا تو وہ چیخ پڑا — لیکن "

جب بھگتو مر جاتا ہے تو ہر شخص خیال کرتا ہے کہ اچھا ہوا کہ دنیا سے ایک ظالم تو کم ہوا۔

لیکن وصیت نامے کو کھولنے کے بعد انسپکٹر کا چیخ پڑنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا بھگتو نے اپنی ساری دولت متھو کی بیوہ کو دے دی؟ یا وہ اپنی ساری دولت اپنے ساتھ چتا میں جلوانا چاہتا ہے —؟ کیا اس کے پاس کوئی دولت نہ تھی —؟ کیا وہ باطنی طور پر فرشتہ تھا اور صرف یونہی بدنام تھا —؟

افسانہ کے اختتام پر اس طرح کے بہت سے خیالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس قسم کے خاتمے پر اس طرح کی گنجائش ہوتی ہے — کہ قاری اپنے اپنے مزاج کے مطابق جس طرح چاہے انجام بنا لے — کرشن چندر کے بعض افسانوں میں اکثر ایسے خاتمے ملتے ہیں۔ جو پڑھنے والے کو چونکا دیتے ہیں اور پڑھنے والا حیرت زدہ ہو جاتا ہے — اور بعض افسانوں کے انجام کچھ ایسے ہوتے ہیں جو قاری کی توقعات کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ کیونکہ کہانی کا تانا بانا اسے ایک خاص انجام کے لیے تیار کر لیتا ہے۔ مگر اختتام پر اچانک کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ پیش آتا ہے کہ انجام قاری کی توقعات کے بالکل برعکس نکلتا ہے ایسے افسانے بھی کرشن چندر کے ہاں بے شمار ہیں۔ جن کے انجام قاری کی توقعات کے برعکس ہوتے ہیں۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی رومانیت ہے۔ وہ حقیقت نگاری کے خواہ کتنے ہی بڑے علمبردار کیوں نہ بن جائیں پھر بھی وہ رومانیت سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رومانیت ان کی سرشت میں داخل ہے لیکن یہ رومانیت ایسی متوازن اور معتدل ہے کہ ابتذال اور فحش نگاری سے دُور ہے۔ اس رومانیت سے دراصل وہ افسانے میں ایک کیف آور، پُرسرور فضا پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں تاکہ قاری کو افسانے میں بوریّت کا احساس نہ ہو۔ یا وہ تلخ حقیقت سے گھبرا نہ جائے۔ لہٰذا حقیقت کی اس تلخی کی شدّت کو کم کرنے کے لیے بھی رومانیت کا عام استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے بعض افسانوں میں رومانیت کا عنصر اس قدر غالب ہے کہ قاری رومانی فضاؤں میں کھو جاتا ہے۔ مگر کرشن چندر ایک پختہ فن کار کی طرح اپنا فنی منصب کبھی نہیں بھلاتے۔ وہ اس رومانی فضا میں بڑی چابکدستی سے کوئی ایسی بات پیدا کر لیتے ہیں کہ کہانی کا تانا پود اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے اور اس فن میں کرشن چندر کو ملکہ حاصل ہے ــــ یہ رومانی فضا خاص کر ان کے افسانوں کی تمہیدوں اور خاتموں میں ملتی ہے۔ وہ شروع ہی میں ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔ اسی طرح ان کی رومانیت خاتمہ کو بھی شدید اور پُر تاثیر بنا دیتی ہے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

"شاید وہ کوئی بھولا بسرا واقعہ یاد کر رہی تھی ــــ معاً مجھے کچھ یاد آیا میں نے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے ــــ؟

نورجہاں ــــ یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آگے چل پڑی۔ چاندنی میں اس کے بال پریشان تھے اور چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔"

(لاہور سے بہرام گلہ تک)

"لیکن اس کے دل کی غیر معمولی خوشی میں ایک عجیب اداسی بھی آ گئی ــــ اور اس کے قدم بھاری ہو گئے اور وہ چلتے چلتے خوشی اور غمی کی ان دونوں حدوں کے درمیان کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں اور نہ ہی گلاب کے پھول بلکہ وقت کے ایسے ہی چند ایک لمحے جو زندگی کی اندھیری رات میں روشن ستاروں کی جھلملاتے رہتے ہیں۔"

(حسن اور حیوان)

ان تمہیدوں اور خاتموں کے علاوہ ان کے افسانوں کے درمیان میں بھی ایسی شدید قسم کی رومانی فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ قاری گھنٹوں اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور یہ رومانی فضا قاری کے دل و دماغ پر نہایت خوشگوار اثر چھوڑتی ہے۔ مثلاً:

"وہ چونک پڑا۔ یہ نئی قسم کی ہنسی تھی۔ البیلی میٹھی۔ کچھ تھوڑی سی خودی تھوڑا سا غرور۔ اس نے سیما کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ لیکن اب ان آنکھوں میں بھی انجان پن نہ تھا اور وہ سیما سے نظر نہ ملا سکا۔ اس نے یکایک محسوس کیا کہ سیما کے چہرے پر ایک نئی دلآویزی آ گئی ہے۔ رخساروں پر ایسی شہابی رونق، جیسی پکے ہوئے سیب پر جسے انسانی ہاتھ نہ چھوا ہو۔ لبوں میں رس اور سرخی اور چمک اور ایک لطیف قسم کی بغاوت۔ جیسے یہ لب اپنے مالک کے اختیار میں نہیں۔"

(سیما ــــ ٹوٹے ہوئے تارے)

کرشن چندر کے افسانوں کا ایک اور نمایاں وصف منظر نگاری ہے۔ اس فن میں تو بڑے بڑے افسانہ نگار ان کا لوہا مانتے ہیں۔ جہاں انہیں جذبات نگاری اور حقیقت نگاری میں مہارت حاصل ہے۔ وہاں منظر نگاری میں بھی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔ خاص کر کشمیر کی وادیوں کی منظر نگاری اُن پر ختم ہے ۔ الفاظ ہی میں ایسے مرقعے کھینچتے ہیں کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور قاری خود کو ان چمن زاروں اور بہاروں کے درمیان کھڑا پاتا ہے ۔ جہاں وہ ٹھنڈے پانی کے بہتے ہوئے چشموں کے مترنم گیت سنتا ہے جھرنوں کے بہنے کی چھما چھم کانوں میں رس گھولتی ہے ۔ صنوبر اور دیودار کے گھنے درختوں کی باس نتھنوں میں محسوس ہوتی ہے ۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو شام کو معطر بناتی ہے اور ان مناظر قدرت کے مقامی رنگ و بو سے کرشن چندر عموماً کہانی کے پس منظر کا کام لیتے ہیں ۔ کشمیر کی وادیاں ۔ کشمیر کی سڑکیں ۔ کشمیر کی پارکیں ۔ کشمیر کے باغات اُن کے افسانوں میں حسن اور تاثر کو زیادہ گہرا بناتے ہیں ۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے :

" وہ پہاڑی انجیر کے درخت کے تنے سے سہارا لے کر بیٹھ گیا ۔ اس درخت کے سامنے انجیر کا ایک درخت تھا ۔ نیچے ایک ٹلمٹی تھی جہاں دو چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں مکی کے پودے اُگے ہوئے تھے ان کے پرے بیچ کی باڑھ تھی ۔ اور اس سے پرے وہی نیلا آسمان اور اس میں مری کے سلسلہ ہائے کوہ اور اُن کے سینے کو چیرتی ہوئی موٹر کی سڑک ۔۔۔ "

" مسافر نے نگاہ پھیر کر نیچے گاؤں کی طرف دیکھا ۔ گھاٹی کے نیم دائرے کے نیچے گاؤں ایک خاموش ندی کے کنارے سویا پڑا تھا ۔۔۔ کھیتوں میں مکی کے پودے چپ چاپ کھڑے تھے ، کناروں پر پیلی پیلی گھاس کسانوں کے ہاتھ اور درانتی کے نغمے کی منتظر معلوم ہوتی تھی ۔ کچے گھروں کی چھتوں پر اوڑھے رنگ کی بجری ڈھلتی ہوئی دھوپ میں چمک رہی تھی ۔ ان چھتوں کے کناروں پر کہیں کہیں پیلی ۔ سبز اور سرخ ٹائلیں رکھی ہوئی تھیں

www.angoothachaap.blogspot.com

یا گول گول سرخ مرچیں "

(حسن اور حیوان)

" میں وہیں ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر اُسے دیکھتا رہا ۔۔۔ وہ گھاٹی کے نیچے جا رہی تھیں ۔ جہاں ندی ایک چھوٹی سی وادی میں بہتی تھی جہاں ایک چھوٹا سا مرغزار تھا ۔ اور سبز تلے پر تین چار خیمے کھڑے تھے ۔ خیمے ! یہ خیمے تو خانہ بدوشوں کے سوا اور کسی کے ۔۔۔ نہیں ہو سکتے ۔ ان میں آگ روشن تھی اور ہلکا ہلکا لطیف سا دھواں سبز تلے کی سطح سے اُٹھتا ہوا آسمان کی طرف جا رہا تھا جہاں بادلوں کا رنگ عنابی اور عنابی سے شہابی ہو چکا تھا ۔۔۔ اور تاروں کے کنول کھلتے جا رہے تھے ۔ "

(شمع کے سامنے)

" مسافر اسی طرح اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا بہت دور نکل گیا ۔ اب ہوا میں خنکی سی آگئی تھی اور سورج مغرب کی طرف جا رہا تھا ۔ سامنے کے پہاڑوں پر صنوبروں کے خاموش جنگل کھڑے تھے جن کا گہرا سبز رنگ کے ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ہلکا ارغوانی سا ہو رہا تھا ۔ یہ رنگ آخر ہے کیا ۔ ؟ نیلا ، پیلا ، سبز اور ارغوانی اور پھر ایک ہی قوس قزح میں ساتویں رنگ یا شبنم کے ایک ہی قطرے میں پوری قوس قزح ۔ "

(آگہی)

منظر نگاری کی ان مثالوں سے صاف عیاں ہے کہ کرشن چندر کو قدرتی مناظر سے خاص دلی لگاؤ ہے ۔ وہ ان مناظر کی روح کو اپنے دل میں سمیٹ لینے کے متمنی ہیں ۔ چیڑ کے درختوں سے گزرتی ہوئی بھیگی ہوائیں ۔ چشموں کا دھیما دھیما شور ۔۔۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ۔۔۔ دیو ہیکل پہاڑ اور ان پہاڑوں

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں بل کھاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں انہیں بے حد پسند ہیں۔ یہ دراصل اُن کی رومانیت کا نتیجہ ہے کیونکہ جب وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں اور اپنے گھناؤنے معاشرے کی برائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے تنگ آجاتے ہیں اور سماج کی بندشیں ان کا گلا گھونٹنا شروع کر دیتی ہیں تو وہ رومانیت کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں پھر انہیں ان سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں سکون ملتا ہے۔ راحت ملتی ہے وہ اس کھلی فضا میں امن و سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ان کا دماغ جو سوچتے سوچتے ماؤف ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر سے تر و تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی رگوں میں زندگی اور اس کی جملہ رعنائیوں سے پھر محبت کرنے کا جوش موجزن ہو جاتا ہے۔ اِسے فرار کہہ لیجئے یا رومانیت۔ بہرحال ایسی بات اُن کے افسانوں کا جزو لاینفک ہے۔ اسی طرح جب وہ کوریا کی جنگ۔ وہاں کے لوگوں کا کشت و خون ——— افراتفری ——— مفلسی اور ظلم کا ذکر کرتے کرتے تنگ آجاتے ہیں تو پھر کوریا کے کسی پہاڑی گاؤں کی تصویر کشی شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں زی شو نامی ایک نوجوان لڑکی رہتی ہے۔ اُس کا مکان خوبصورت اور پختہ ہے۔ باہر کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ سرسبز پہاڑ اور لمبے لمبے ساگوان کے درخت ہیں۔ کہیں کہیں نیبٹر کے درختوں کے جھنڈ ہیں جن پر پرندے مدھر گیت گاتے ہیں ——— پھر اس منظر نگاری کے ساتھ ہی کہانی کو نقطۂ عروج پر لے آتے ہیں۔ جہاں سے رفتہ رفتہ انجام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی امر اُن کے فن کی عمدہ دلیل ہے کہ وہ اپنے موضوع کو اظہار بیان میں منتقل کرتے وقت انتہائی توازن سے کام لیتے ہیں اور وہ موضوعات جن میں انہیں شدت اور تلخی محسوس ہوتی ہے۔ انہیں جب افسانے کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو بہت محتاط ہو جاتے ہیں۔ نہ اس موضوع میں وہ شدت رہتی ہے کہ پڑھنے والے کو بار محسوس ہو اور نہ اتنی قلت کہ حقیقت پر شک ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں میں تاثیر کی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ "صرف ایک آنہ" ہے جس میں اس سنگین حقیقت پر سے نقاب کشائی کی ہے کہ

انسان اور بچھو کا انسان ایک آنہ کے لیے زندگی کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ لیکن اس افسانے میں جو کچھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ رومانیت کی تہوں میں اس طرح لپیٹ کر پیش کیا ہے کہ اس کی تلخی کا احساس قدرے کم ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا شگفتہ اسلوب بیان بھی اس تلخ حقیقت کو کسی حد تک کم کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس دنیا سے بیزار نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ناقابل فراموش سبق حاصل کرتا ہے کیونکہ اس رومانیت سے وہ شدت اور تلخی کم ہو جاتی ہے جو افسانہ نگار خود محسوس کرتا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں کی ساخت اور بناوٹ اور تعمیر و تشکیل نہایت منظم ہوتی ہے۔ وہ افسانے کے فنی اجزا میں تمہید واقعات کا اتار چڑھاؤ نقطۂ عروج اور انجام سے بخوبی واقف ہیں اور انہیں علم ہے کہ ان اجزاء کو کس طرح اور کیسے موقع پر استعمال کرنا ہے ان اجزا کو وہ ایک اعلیٰ اور عظیم فن کار کی طرح پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے کی ظاہری شکل و صورت جسے وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وسیلہ کی طرح استعمال کرتے ہیں ان کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہے۔ جو بعض اوقات افسانویت اور لذتیت میں ڈھل جاتا ہے۔

افسانے میں زور بیان کے لحاظ سے مولانا صلاح الدین احمد نے اُن کے افسانہ "سفید پھول" کو بہترین افسانہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں کرشن چندر نے اپنی اعلیٰ فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ مناظر کی تصویر کشی کے علاوہ ——— گونگے کی بالا کے تاثرات کے بیان میں جادوگری ہے اور قاری اُسے پڑھ کر سرور اور کیف کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے کیونکہ اس افسانہ میں ذہنی کیفیات کی عکاسی کے علاوہ نفسیاتی تجزیہ اعلیٰ معیار کا ہے۔ جو افسانے کا حسن ہوتا ہے۔ اور افسانویت و لذتیت کا عنصر بھی بڑھ کر ہے۔ سفید پھول دراصل کرشن چندر کے پہلے افسانوں میں سے ہے لیکن موجودہ افسانوں میں "کچرا بابا" اُن کا بہترین افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ذہنی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کیفیات ۔ واردات قلبی اعلیٰ تمہید ——— عمدہ انجام اور کردار نگاری کے علاوہ وہ تلخ حقیقتیں بھی ہیں جن کا ہماری روزمرہ کی زندگی سے گہرا واسطہ ہے اور مرکزی کردار کی نفسیات کا تجزیہ ایسے ستھرے انداز میں کیا ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اسی لیے اس انتخاب میں کچرا بابا افسانہ بھی شامل کیا جا رہا ہے ۔

افسانے کے ان فنی لوازمات اور تکنیک کے ان مراحل کے علاوہ کردار نگاری میں کرشن چندر کی فنی صلاحیتیں کچھ اور بھی نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ ان کے کردار جیتی جاگتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسے کردار ہیں جو ہمیں زندگی میں ہر بازار — ہر گلی کوچے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں وہ محبت بھی کرتے ہیں ۔ وہ نفرت کے جذبات سے بھی مغلوب ہوتے ہیں ۔ قربانی و ایثار کے لیے بھی تیار ہو سکتے ہیں ۔ وہ عام انسانی جذبات سے متصف ہیں وہ لطیف احساسات بھی رکھتے ہیں ۔ ان کے سینوں میں دکھ درد اور خوشی و مسرت کے جذبات پنہاں ہیں اور ان کی کمزوریاں سب انسانی زندگی سے متعلق ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر نے اپنے کردار حقیقی زندگی سے منتخب کر کے ان کو فنی لحاظ سے انفرادیت بخشی ہے ان کے تمام کردار ذہنی یا مثالی نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کا تصنع یا بناوٹ ہوتی ہے ۔ بلکہ تمام حقیقت نگاری کے رنگوں سے پُر ہوتے ہیں اور عموماً ہماری سوسائٹی اور معاشرہ کے افراد ہوتے ہیں لیکن ان میں اپنی اپنی فطری انفرادیت ضرور موجود ہوتی ہے ۔ کرشن چندر کا چھوٹے سے چھوٹا کردار بھی قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے : "صرف ایک آنہ" میں حا کہ نورین کا کردار بہت معمولی سا ہے مگر اس کی سچی اور صحیح تصویر لانے میں کرشن چندر کی فنی چابکدستی ملاحظہ فرمائیے :

"نورین نے ایک نیلے رنگ کی قمیض اور پتلون پہن رکھی تھی ۔ جس پر جابجا تیل کے دھبے نظر آ رہے تھے اس کی چھوٹی سی ناک پر بہت بڑی عینک تھی ۔ بہ حیثیت مجموعی وہ ایک گندا ۔ بدنما اور رحم دل انسان نظر آتا تھا ۔"

عام کارخانوں اور فیکٹریوں میں ایسے کردار یہاں ضرور مل جائیں گے جو کرشن چندر کے نورین سے مشابہ ہوں گے ۔ لیکن اس کردار کی عکاسی اس امر کی غمازی کرتی ہے ۔ کہ کرشن چندر کا مشاہدہ نہایت عمیق ہے ۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی چال ڈھال ۔ چہرے کے خدوخال کا نقشہ اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں ۔

اب بھگت رام کا حلیہ اور کردار ملاحظہ ہو — جو کرشن چندر کے اعلیٰ کرداروں میں سے ایک ہے :

"بھگت رام لٹھ گنوار تھا ۔ بات بات میں اکھڑ ۔ دیکھنے میں اکھڑ گندہ ۔ ناتراش ۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں ۔ بڑے بڑے دانت ۔ بتیسی ہر وقت کھلی ہوئی لبوں سے رال ٹپکتی ہوئی جب ہنستا تو بتیسی کے ساتھ مسوڑھوں کی پوری پوری نمائش ہوتی ۔ گاؤں ہر شخص کا سر گھٹا ہوا تھا اور ہر ہندو کے سر پر چوٹی تھی لیکن بھگت رام نے بلوچیوں کی طرح لمبے لمبے بال بڑھا لیے تھے اور چوٹی غائب تھی ۔ بالوں میں بڑی کثرت سے جوئیں ہوتیں ۔ جنہیں وہ اکثر گھراٹ کے باہر بیٹھ کر چنا کرتا تھا ۔ سرسوں کا تیل سر میں دو تین بار رچایا جاتا ۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور بیچ میں سیدھی مانگ نکال کر اور زلفیں سنوار کر وہ سرِ شام گاؤں کے چشموں کا طواف کیا کرتا ۔ اپنی ان بری حرکتوں سے کئی بار پٹ چکا تھا — لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا ۔ بڑی موٹی کھال تھی اس کی اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کے شعور میں ضمیر کی آگ کبھی روشن ہوئی نہ تھی ۔ وہ شرار ناپید تھا — جو حیوان کو انسان بنا دیتا ہے ۔ بھگت رام سو فیصد حیوان تھا ۔ اسی لیے گاؤں والے براہمن اور کھتری ۔ امیر اور غریب ۔ ہندو اور مسلمان اور سنار اور چمار سب اس سے نفرت کرتے تھے ———"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بھگت رام ایک ایسا کردار ہے ۔ جس کو کرشن چندر نے اپنی فنی صلاحیتوں سے زندہ جاوید بنا دیا ۔ اور بھگت رام نے کرشن چندر کے فن کو ابدیت کی سرحدوں پر لا کھڑا کیا ہے ۔ اسی طرح آن کا معمولی سا کردار آنگی ہے ۔ جو پہاڑوں میں اپنے گلے کو چراتی ہے اور ایک آزاد ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر اُچھلتی کودتی پھرتی ہے ۔ اس کا کردار ملاحظہ ہو :

" راہی سوچنے لگا ۔ یہ خواب کی سی خاموشی ، یہ موت کی سی زندگی یہ آنگی کے رخ پر بل کھاتی ہوئی زلف ، کیا یہ سب عجیب نہیں ۔ آنگی کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے اور اس میں درجنوں پیوند لگے ہوتے ہیں مگر وہ کس شان سے گرم ملن اونچی کیے ندی کی طرف دیکھ رہی ہے ۔ جس کے پانیوں کا رنگ اس کی آنکھوں کی طرح نیلا ہے ۔ کیا یہ عجیب نہیں ۔ آنگی کے ہاتھ کس قدر مضبوط نظر آتے ہیں ۔ لمبی مخروطی ، مضبوط انگلیاں جو بل کی ہتھی پر زور سے جم جاتی ہیں ۔ ان کلائیوں نے غالباً چوڑیوں کی کھنک نہیں سُنی ۔ کس قدر عجیب بات ہے " ۔

آنگی کے علاوہ ٹوٹے ہوئے تارے میں زبیدہ عورت کا کردار بھی جاذب نظر ہے جس کا بچہ بیمار ہے اور اس کے پاس دوائی کے لیے چار روپے نہیں ۔ اپنے بچے کی زندگی کے لیے وہ اپنی عصمت کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے اور ایک رات کے لیے بنگلے کے چھیلے بستر کی زینت بنتی ہے ۔ اس کے سینے میں ماں کا دل کس قدر دھڑکتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ اُس وقت قاری پر بھی رقت طاری ہو جاتی ہے جب وہ روتے ہوئے لہجہ میں مسافر سے کہتی ہے :

" میرا بچہ بیمار ہے ——— میرا میرا ننھا سا بچہ ——— ڈاگ دار نے کہا ہے ۔ اُسے نمونیا ہو گیا ہے ——— وہ چار روپے فیس مانگتا ہے ۔ بیرے نے مجھے صرف تین روپے دیے ہیں ——— خدا کے لیے مجھے ایک روپیہ اور دے دو ——— "

ان امثال سے واضح ہے کہ کرشن چندر کے کردار کس قدر زندگی کے قریب ہیں ۔ اور وہ عام انسانی جذبات سے کہاں تک متصف ہیں ———

" زندگی کے موڑ پر " ایک طویل مختصر کہانی ہے جس میں پرکاش کا کردار کرشن چندر نے بڑی محنت ، محبت اور فن سے تخلیق کیا ہے یہ افسانہ دراصل ان کے فن کا ایک ٹھپے ہے اور یہ کردار ان کی تخلیقات میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے ——— بھگت رام کی حرکات و سکنات و احساسات فطری طور پر انسانی ہیں تفصیلات و جزئیات سے جیسے پرکاش کی نوک پلک سنواری گئی ہے اسی طرح بھگت رام کو مختلف برائیوں سے سجایا گیا ہے ——— ان کرداروں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ——— یہ کردار نگاری کے اصلی اور حقیقی تقاضوں کا واحد جواب ہیں ۔

افسانے میں بعض مقامات پر شگفتگی اور طرب انگیز فضا پیدا کرنے کے لیے افسانہ نگار کو طنز و مزاح کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ جس سے افسانے کی تخلیق حقیقتوں میں ایک طرح کی خوشگواری پیدا ہو جاتی ہے اور طربیہ عنصر اُجاگر ہو جاتا ہے کرشن چندر نے بھی اس فنی خوبی کو اپنے افسانوں میں برتا ہے اور موقع محل کے مطابق اس سے پوری طرح استفادہ کیا ہے ——— ان کے مزاح میں ایک طرح کی شیرینی اور مٹھاس ہے ——— جو تبسم ریز ہے ۔ شہد اور پھکڑ پن سے بالکل مبرا ہے ۔ وہ اس مزاحیہ فضا کو ظریفانہ رنگ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھاتے رہتے ہیں لیکن اس مزاح میں کہیں بھی شدت اور تیزی نہیں ہے ۔ بلکہ ایک مخصوص اعتدال اور سنبھلی ہوئی کیفیت ہے ۔ مولانا صلاح الدین احمد ان کی مزاح نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

" کرشن چندر کی طنز نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جھٹکے نہیں لگاتا بلکہ چٹکیاں لے لیکر ہی مار ڈالتا ہے ـ پڑھنے والے پر چھا جانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا ——— اور نہ ہی اسکا مزاج

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بگاڑتا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ مضمون کے عنوان کو دیکھ کر آپ اس کی مخالفت پر تُل جاتے ہیں۔ لیکن جب مضمون ختم کر لیتے ہیں تو خود کو اس کے ہمرکاب پاتے ہیں۔ یہ ادبی کیفیت اردو کے بہت کم طنز نگاروں کو میسّر ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور رجحان ادبی کے لحاظ سے محض طنز نگار ہوتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن کرشن چندر کی ادبی تربیت ایک رومانی ماحول میں ہوئی اور اس نے زندگی کے ساتھ ہنسنے کی کوشش ہے۔"

یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے طنزیہ فقروں کا لہجہ تلخ اور ترش نہیں ہوتا۔ بلکہ نہایت دھیما اور بے ضرر ہوتا ہے اگرچہ اُن کے ایسے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے جن پر خالص مزاح کا لیبل چسپاں کیا جا سکے۔

البتہ ایسے افسانے کافی ہیں جن میں کہیں کہیں مواقع کے مطابق مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ ایسے افسانوں میں دل کا چراغ ـــــ خونی ناچ ـــــــــــ بے رنگ و بُو ـــــ دو فرلانگ لمبی سڑک ـــ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً "دل کا چراغ" افسانہ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"اب مجھے چار بجے کوئی نہیں جگاتا ـــ بالوجی جو دوسرے حصے میں ہیں "اٹھ جاگ مسافر بھور بھئی" کے ریکارڈ نہیں بجاتے کیونکہ وہ فساد میں ٹوٹ گئے تھے۔ اب کوئی دل کا چراغ روشن کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اب بالکل امن ہے۔ لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر روز شکار پور اور جلال پور کی خبریں پڑھ لیتا ہوں ـــ"

اسی طرح "حسن اور حیوان" افسانے میں اگرچہ ساری فضا سنجیدہ ہے۔ مگر ان جملوں سے اچھا خاصا مزاح پیدا ہو گیا ہے۔

"حضور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دیکھو دیکھو کیسی دکھیوں سی باتیں کرتی ہے۔ تیری سب شوخی نکال دوں گا۔ ذرا ٹھہر تو پہلے مجھے اس سے نپٹ لینے دے۔ کیوں بے اُلّو کے پٹھے۔

اُلّو کے پٹھے نے کانپتے ہوئے کہا ــــ میں۔ میں نے کوئی اغوا نہیں کیا ــــ"

اسی طرح "یرقان" ایک شدید قسم کا المیہ ہے۔ جس میں ظرافت اور مزاح کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ مگر کرشن چندر نے اپنی فنی احتیاط اور فنی شعور کا کمال یہاں بھی دکھایا ہے۔ لہٰذا اس افسانے کا آغاز ہی ان جملوں سے کرتے ہیں۔

"یرقان بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں۔ یہ بھی ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے۔ سائنسدان کے اس مفروضہ کی طرح کہ چاند بذات خود روشن نہیں، دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے ڈاکٹر اور سائنسدان عامیوں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ورنہ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری بات بر مطلق یقین نہ کیا جائے اور اسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاقِ نسیاں پر دھر دیا جائے۔"

اسی طرح آگے چل کر شاما کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"میں بجا خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا۔ محبت۔ نہیں یرقانیت ـــــ یا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان ـــــ؟

شاما دراصل ایک غریب بیاہتا لڑکی ہے جو اپنے خاوند کا خط پڑھانے کے لیے ان کے پاس آتی ہے اور یہ اُن دنوں یرقان میں مبتلا ہوتے ہیں ـــ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

محبت یا برتقانیت کیسا مزاحیہ جملہ ہے۔ یہ باتوں ہی باتوں میں طنز کے تیز و نشتر استعمال کرنے کا ڈھنگ کرشن چندر کو ہی آتا ہے۔ اسی قسم کی اور مثال ملاحظہ ہو جو افسانہ "جان پہچان" سے مقتبس ہے۔

"آپ بی۔ اے میں پڑھتے ہیں نا   دراصل آج سے دو سال پہلے
اس سینما کے دروازے پر ملے تھے اور بالکل یہی گفتگو ہوئی تھی ؛
بڑی مشکل سے ضبط کر کے جواب دیتا ہوں نہیں جی   میں نے
تو بی اے دو سال ہوئے پاس کر لیا تھا۔ آج کل منٹو پارک میں گنڈیریاں
بیچتا ہوں۔"

کرشن چندر کی طنز کے تیر نہ تیکھے ہوتے ہیں اور نہ ہی گھائل کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ظرافت کا پہلو بھی لیے ہوئے ہوتے ہیں جس کی بنا پر وہ شخص بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا جس پر طنز کی گئی ہو ——— یہ سب کچھ کرشن چندر کے عظیم فن کار ہونے کے ثبوت ہیں۔

کرشن چندر فن کی ان روایات کے محافظ ہیں۔ جن کی اساس پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے قائم کی تھی ۔ اور انھوں اپنی محنت اور خلوص سے افسانے کے فن کو وہ عظمت عطا کی ہے جو ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی نہ دے سکا۔ انھوں نے اپنے جگر کا خون دے کر اس پودے کی آبیاری کی ہے۔ اسی لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جب تک اردو ادب زندہ ہے کرشن چندر اور اس کا فن زندہ ہے۔

ایس اختر جعفری
ایم۔ اے
ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

خمیازہ

آپ مجھے پہچان گئے ! جی ہاں میں ہی اکرام علی شاہ بین الاقوامی شہرت یافتہ فوٹوگرافر ہوں۔ کلب کے باہر شربتی رنگت کی جو ٹائیوٹا گاڑی کھڑی ہے وہ مجھے پچھلے سال جاپان کی ایک فوٹوگرافنگ نمائش میں اول آنے پر انعام میں ملی تھی اور یہ پولورائیڈ کیمرہ اور آئی کن زیوس کیمرہ دونوں مجھے نیویارک کی نمائش میں دوسرے نمبر پر آنے پر ملے تھے۔ جی ہاں، جی ہاں، آپ نے مجھے جس فاران لڑکی کے ساتھ میرین ڈرائیو پر اکثر گھومتے دیکھا ہے، بمبئی میں وہ مادریا تھی میری ماڈل۔ میں نے سمندر کے کنارے اس کی بہت سی تصویریں لی ہیں۔ مجھے عورت اور سمندر میں زیادہ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں کی شخصیت پراسرار ہے۔ دونوں بلاوجہ طوفانی ہو جاتے ہیں، کبھی بلاوجہ شانت۔ ابھی سمندر کی لہریں پیار کرنے والی عورت کی طرح ساحل کو اپنی انگلیوں سے گدگداتی ہیں۔ چند لمحوں بعد یہی کمزور لہر مہیب اچھال بن کر ساحل کو کاٹنے لگتی ہیں۔ نہ سمندر سمجھ میں آتا ہے نہ عورت۔ شاید اسی لیے میں ان دونوں میں بے حد کشش محسوس کرتا ہوں۔

آپ نے ابھی عورت کے بھول اور بے وقوف ہونے کی جو بات کہی تو اس سلسلے میں ایک قصہ سناتا ہوں۔ قصہ کیا ہے واقعہ ہے۔ ذرا وسکی اور لے لوں، جام خالی ہے۔ بیرہ، ادھر گلاس میں ایک ڈبل ڈمپل مانند۔

ہم سب پہلگام کلب کی بار کے اونچے اونچے اسٹولوں پر بیٹھے ہوتے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

عورتوں کی معصومیت، انجانا پن اور حماقتوں کے قصے سنا[illegible] رہتے تھے۔ کیونکہ تم میں کوئی عورت نہیں تھی [illegible] میں بیگم [illegible] تھے۔ اکرام کا جواب یہ پانچواں جواب ہوگا۔ اس کا چہرہ انار کی طرح سرخ تھا۔ اس نے یورپ کا کلاسی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور گہرے رنگ کی [illegible] بو ٹائی۔ دونوں گھنی بھویں ماتھے کے بیچ آکر مل گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک تیز عیار چمک تھی جب ہنستا تھا تو اس کے چہرے پر ایک سیلاب اور بکھرے ہوئے لفظوں کی مطمئن بے فکری چھا جاتی مگر ایسی بے فکری جس میں ایک رنگ ذہانت کا بھی تھا اور وہ ذہانت اس کی آنکھوں میں تھی۔

اکرام نے وسکی کے دو گھونٹ لیے۔ گلاس اٹھا کر اسے دو تین بار مختلف زاویوں سے بار کی تنگ میز کی سطح پر دائرے بناتے۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا، کہاں سے شروع کرے۔ پھر جیسے اس کی سمجھ میں پورا واقعہ آگیا۔

اس نے اپنا سلسلۂ کلام شروع کیا:

"یہ چار دن پہلے کا واقعہ ہے اور اب اسے سنانے میں کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ لڑکی یہاں سے جا چکی ہے۔ آج سے چار دن پہلے میں نے اس لڑکی کو غلام رب کے جنرل اسٹور میں خریداری کرتے دیکھا تھا۔ کندھے سے لٹکے ہوئے جھولے میں نئی باسکٹ تھی اور وہ غلام رب کے پھلوں کے ڈبے، مکھن کا ڈبہ، سامن مچھلی کا ڈبہ اور دوسری بہت سی CANNED GOODS خرید رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا کیونکہ میں نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا تھا جیسے آپ نے پہلی نگاہ میں مجھے پہچان لیا۔ یہ سجاتا تھی۔

سجاتا کو آپ نہیں جانتے [illegible]۔ سجاتا کا شمار بمبئی کی چند [illegible] لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ ایک زمانے میں اس کا بڑا غلغلہ تھا کچھ عرصے تک اس نے فلموں میں بھی کام کیا مگر چلی نہیں۔ فلم میں چلنے کے لیے شکل کے علاوہ تھوڑی سی عقل بھی چاہیے — خوب صورت عورت کو زیادہ عقل کی ضرورت نہیں۔

لیکن پھر بھی تھوڑی سی تو چاہیے، یعنی آٹے میں نمک کے برابر۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ فلموں میں کیوں نہیں چلی، کیونکہ میرا تعلق کسی فلم سے نہیں ہے۔ اس کے بعد سنا ہے وہ لندن جا کر ماڈلنگ کرنے لگی۔ مگر وہاں بھی زیادہ نہیں چلی۔ کیونکہ ہندوستانی لڑکی تھی اور یورپین لوگ زیادہ تر یورپین لڑکیوں کے خدوخال ہی پسند کرتے ہیں۔ پھر وہ واپس ہندوستان آگئی اور کمال اینڈ سنز بک سیلرز اینڈ پبلشرز کے ہاں کتابیں بیچنے لگی۔ مگر وہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ کیوں کہ خوب صورت کتاب اور خوب صورت عورت میں ایک طرح کا بیر ہوتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ خوب صورت عورت خود ایک کتاب ہوتی ہے۔ کئی باب میں تقسیم ہوتی ہے۔ اور ہر صفحہ پر ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔ اس لیے چھ مہینے کتابیں بیچنے کے بعد اس نے توبہ کر لی اور اپنے لیے ایک شوہر ڈھونڈنے لگی۔

یہ سب باتیں میں اس لیے جانتا ہوں کہ میں ایڈورڈ والیری نیو میں رہتا ہوں اور سجاتا آرام الیری نیو میں رہتی ہے، جو ایڈورڈ والیری نیو سے ملحق ہے۔ ایڈورڈ والیری نیو کے نکڑ پر جی وانیس کا جنرل اسٹور ہے۔ یہاں پر کبھی کبھار میری اور اس کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ گو گفتگو کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اس جنرل اسٹور میں وہ تصویر کشی کے کاغذ خریدنے آتی تھی اور میں اپنی فوٹوگرافی کا سامان۔ کئی بار ہم کاؤنٹر پر ساتھ ساتھ کھڑے دیکھے گئے۔ ایک دو بار میری اور اس کی کہنی کے درمیان صرف دو انچ کا فاصلہ رہ گیا۔ مگر اس سے بات چیت کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ سجاتا اپنے حسن پر اپنے سنہری بالوں پر اپنے گیلے سرخ لبوں پر اپنی بھوری آنکھوں پر بے حد مغرور نظر آتی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں پہل کروں اور میں چاہتا تھا وہ پہل کرے اور میں نے دیکھ لیا ہے کہ جس معاشقے میں مرد پہل کرتا ہے اسے اس کا ضرورت سے زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ پھر کچھ یہ بات بھی ہے کہ میں اپنی نا تیونٹا پر بے حد نازاں تھا، اور سوچتا تھا کہ جس مرد کے پاس ایسی خوبصورت گاڑی ہوگی اس کا دروازہ کھول کر لڑکی کو خود بخود بیٹھ جانا چاہیے۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

چنانچہ یہ دل چسپ کش مکش دیر تک چلتی رہی۔

میں اسے اکثر مختلف مردوں کے ساتھ دیکھنے لگا۔ وہ لوگ بھی گاڑی والے تھے اور خوش پوش اور کھاتے پیتے چہرے والے۔ جب وہ بار بار اور جلدی جلدی اپنے بوائے فرینڈ بدلنے لگی تو مجھے اس کے اخلاق پر شبہ ہونے لگا۔ حالانکہ جلدی جلدی بوائے فرینڈ بدلنا آج کل ہر شریف لڑکی کا شیوہ بن گیا ہے کیونکہ یہی فیشن ہے اور جو لڑکی اس فیشن کو اختیار نہیں کرتی وہ ہائی سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتی ہے۔ مگر بار بار ان نئے نئے چہروں کے بیچ میں میں ایک چہرہ بار بار دیکھتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مضبوط بدن کا ٹھوڑی پر خشخشی داڑھی لیے ہوئے ایک نوجوان تھا۔ سرمے رنگ کی پتلون میں آتا تھا اور کسی فوجی کی طرح سیدھا کسی بینڈھے کی طرح گردن اٹھائے چلتا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس سے نفرت ہوتی گئی۔ مگر یہ جان کر تسلی ہوتی تھی کہ سجاتا دوسرے مردوں کے ساتھ بھی جاتی ہے اور کسی دن دوسرے مردوں میں میرا نمبر بھی آسکتا ہے زندگی اور عشق امید پر قائم ہیں۔ اسی لیے تو میں آج سے چار دن پہلے سجاتا کو پہلگام کے بازار میں غلام بٹ کی دکان پر خریداری کرتے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ اکیلی تھی جگہ بھی نئی تھی اور سادیا مجھے غچّا دے کر لندن چلی گئی اور میں اکیلا تھا اور پہاڑوں پر اکیلاپن بہت کھل جاتا ہے۔ خوب صورت پھول، پگھلتی ہوئی برف بنتے ہوئے جھرنے، سرگوشیاں کرتے ہوئے اشجار سب عورتوں کی یاد دلاتے ہیں۔ ٹورازم کے محکمے کو اس طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ کال گرل کا نام تو بہت بدنام ہو چکا ہے، اس کی جگہ اگر ٹورسٹ ہوسٹس کا نام رکھ دیا جائے تو اپنا کام بھی بن جائے اور حکومت پر بد اخلاقی کا الزام بھی نہ آئے۔ کیوں، کیسی رہی یہ تجویز؟۔

خیر صاحب، میں دکان کے اندر چلا گیا اور بڑی بے خوفی بلکہ گہری اپنائیت سے اسے کہا "ہیلو!"

وہ میری طرف مڑی، آنکھوں میں حیرت لیے ہوئے۔ پھر مجھے پہچان لیا اور جب پہچان لیا تو اس کا چہرہ ماتھے سے ٹھوڑی تک ایک روشن مسکراہٹ سے چمک چمک گیا۔ دراصل اجنبی پہاڑوں پر اگر کوئی اپنا پہچان والا مل جائے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔

"ہیلو!" وہ بولی "آپ ایڈورڈ ایوی نیو میں رہتے ہیں نا؟"

"ہاں!" میں نے سر ہلایا "اور آپ آرام ایوی نیو میں!"

"گویا ہم دونوں ہمسائے ہیں!" وہ خوشی سے ہنسی۔

میں نے پوچھا "آپ اکیلی آئی ہیں؟" (ابھی اس امر کا اطمینان کر لینا ضروری ہے)۔

"بالکل، شہری زندگی کی ہما ہمی سے بہت اوب گئی تھی" وہ بولی "سوچا پہلگام جا کر کچھ دن اکیلے رہوں گی۔ قدرتی مناظر کی مصوری کروں گی!"

"میں بھی اکیلا ہوں" میں نے اسے بتایا "پہلگام کی فوٹو ڈاکومنٹری تیار کرنے کے لیے آگیا۔ مگر اس ڈاکومنٹری کے لیے آپ کی مدد درکار ہوگی!"

"وہ کیسے؟"

میں نے کہا "خالی قدرتی مناظر کی تصاویر لینا میری ڈاکومنٹری کو گھسی پٹی بنا دے گا۔ ان خوب صورت مناظر میں جان ڈالنے کے لیے ایک خوب صورت لڑکی بھی چاہیے۔ تم ان مناظر میں معنی پیدا کر دو گی!"

"آپ تعریف کرنا جانتے ہیں!" وہ پہلے تو شرمائی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"عجیب بات ہے!" میں نے اس سے کہا "اتنے دنوں سے ہم دونوں ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں مگر ملاقات آج ہوئی!"

"میں بھی آپ کو مادام ڈائنس کی دکان پر فوٹو گرافی کا سامان خریدتے دیکھتی تھی اکثر، مگر نہ جانے بات چیت کیوں نہیں ہوئی!"

"قصور دراصل میرا ہے۔ اتنی حسین و جمیل لڑکی سے مرعوب ہو جانا قدرتی امر ہے!"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"مگر میں تو معمولی لڑکی ہوں اور مغرور بھی نہیں ہوں۔"

میرا جو وقت بمبئی میں ضائع گیا اس کی تلافی یہاں ہو سکتی ہے، میں نے گہری نظروں سے اسے تاکتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں" وہ بولی۔

"مجھے اکرام کہتے ہیں۔ اور آپ کا نام تو میں جانتا ہوں، سجاتا۔ آپ کہاں ٹھہری ہیں؟"

"منور ہوٹل کے قریب، کاٹیج بی چالیس میں کا نمبر ہے، اور آپ...؟"

"میں روز ڈیل ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ کمرہ نمبر اٹھارہ۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" اس نے کاؤنٹر سے مڑ کر ایک قدم دکان کے باہر کی جانب بڑھایا۔

میرا ہاتھ بے اختیار اس کی کلائی پر گیا۔ "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ چلیے روز ڈیل ہوٹل میں آپ کو بہت بڑھیا کافی پلاؤں گا۔ ایسی اچھی کافی پہلگام میں اور نہیں ملتی۔"

وہ تھوڑی دیر تو مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی رہی، پھر اس نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا ہو، مسکرا کر بولی: "اچھا چلیے۔"

میں نے سوچا یہ پہلا قدم ہے۔ لاؤنج میں بیٹھیں گے۔ نرگسی پھولوں کے گلدان کی اوٹ میں اس کی آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہوں گا اور اس کے پیارے چہرے کی دل چسپ ادائیں۔ باتیں ہوں گی، کتابوں کی، مصوری کی، ماڈلنگ کی، جدید ترین فیشن کی۔ پھر میں اسے اپنے تازہ ترین فوٹو البم دکھانے کے لیے اپنے کمرے میں جانے کی دعوت دوں گا۔ یونہی زینہ بہ زینہ عشق کا جذبہ بلند ہوتا ہے۔

یونہی سب کچھ ہوا۔ کتابوں کی باتیں ہوئیں، اسے جاسوسی ناول پسند تھے اور ایسی کتابوں سے نفرت تھی جن میں عقل ہوتی ہے۔

وہ بولی: "اکرام کہنے میں جبڑا دکھنے لگتا ہے۔ اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں اکی کہا کروں؟"

"اکی" میں دل ہی دل میں خوشی سے اچھل پڑا۔ اب تک میرا نام کسی بھی گرل فرینڈ کو آج تک کیوں نہیں سوجھا۔

"تمہارے منہ سے اکی بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر تمہارے لیے کبھی مجھے اکرام نہ کہنا۔"

وہ زور سے ہنسی، دیر تک ہنستی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دیا۔ میں اس کی انگلیوں سے کھیلنے لگا وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے گلدان کے نرگسی پھولوں کو سجانے لگی۔

میں نے پوچھا: "سجاتا تمہیں عقل رکھنے والی کتابوں سے نفرت کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ میں اکثر دیکھتی ہوں کہ تمام کتابوں پر حتیٰ کہ فلسفے کی کتابوں پر بھی کسی خوب صورت عورت کی تصویر ہوتی ہے۔ اب اگر کسی کتاب کو عورت کے سہارے کے بغیر بیچا نہیں جا سکتا تو یہ تو عقل کی بہت بڑی توہین ہے۔"

"عقل کی توہین نہیں ہے، عورت کی توصیف ہے۔ در اصل عورت خود ایک طرح کا فلسفہ ہے۔ اس کتاب کو کھول کر ورق ورق پڑھنا چاہیے۔"

میں نے پوچھا: "فلموں میں تمہیں کیسی فلمیں پسند ہیں؟"

وہ بولی: "ایسی فلمیں جن میں مرد بے وفا ہوتے ہیں اور عورتیں ان کے لیے رو رو کر جان دے دیتی ہیں، یعنی بالکل سدائی فلمیں۔"

"اور ماڈلنگ کیوں چھوڑ دی؟"

"وہ لوگ اسٹوڈیو کو بیڈ روم میں بدلنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور میں دونوں جگہوں کو الگ الگ سمجھتی ہوں۔"

کافی جلدی ختم ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا: "تمہارے لیے ایک کافی اور منگاؤں؟"

"نہیں، اب میں جاؤں گی۔" وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔

میں نے کہا: "اوپر چلیے، میرا تازہ فوٹو البم دیکھیے، میرے کمرے میں۔"

یہ تو مجھے کہنا ہی تھا۔ اس بات کو تو کہا ہی جاتا ہے، ایک نہ ایک وقت، اور جواب سننے کے لیے دل دھڑکتا ہے۔

وہ ذرا سنجیدہ ہوئی، مسکرائی، پھر میری طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں نے اداس ہو کر کہا: "شاید تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔"

"میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔" وہ لاپرواہی کے انداز میں ہاتھ جھلا کر بولی "تو کمرے میں کیوں چلیں، کیا ہم لوگ پہاڑوں پر کمروں میں بند ہونے آئے ہیں۔"

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا

اس نے پوچھا: "تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

"ہاں"۔ کچھ امید بندھنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا "اپنی ٹائیوٹا ساتھ لایا ہوں۔"

"تو پہلگام سے دور کہیں چلتے ہیں۔" وہ بولی "میرے ذہن میں ایک جگہ ہے۔ چندن واڑی کے راستے پر، بائیں جانب ایک وادی کے دامن میں پہاڑی جھرنا ہے۔ دیودار کے پیڑوں کا ایک خوب صورت کنج ہے، سامنے پھولوں کی جھاڑیوں سے بھرا ہوا ایک میدان ہے وہاں چلیں گے۔ لنچ ساتھ لے چلتے ہیں۔ وہاں دن بھر رہیں گے، شام کو لوٹ آئیں گے۔ تم اپنا کیمرہ لے چلو۔ میں اپنا مصوری کا سامان لے چلتی ہوں۔ یعنی اگر ہم ایک دوسرے سے اکتا گئے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ عجیب طریقے سے ہنسی۔

میرے ذہن میں وہ وادی گھوم گئی اور ہم دونوں بچوں کی طرح پھولوں کے قطعوں پر لوٹتے ہوئے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوڑتے ناچتے ہوئے، پھولوں میں گھر کر ایک دوسرے سے لپٹ کر پیار کرتے ہوئے گرم نگاہوں میں گرم گرم سانسوں میں ننھی ننھی سرگوشیاں جو محبت کے چشمے پر بلوریں حباب کی طرح ناچتی رہتی ہیں وہ سب کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے اپنی گاڑی نکالی اور رین جکی کے پل سے ہو کر چندن واڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ہوا تیز تھی، سجاتا کے بال گہرے گلابی ہو چلے تھے۔ اس نے اپنے اڑتے ہوئے بالوں پر ایک کشمیری رومال باندھ لیا تھا جس سے وہ بے حد پراسرار معلوم ہونے لگی تھی۔ میں جلد سے جلد اس کنج میں پہنچ جانا چاہتا تھا، مبادا کہیں سجاتا اپنا ارادہ تبدیل نہ کر دے۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں وہ وادی سامنے آ گئی۔ یہاں سڑک اوجھل ہو گئی

تھی۔ میں نے انجن بند کر دیا، اور پٹ کھول دیا۔ سجاتا اپنا سامان لے کر باہر نکلی اور میں اپنا سامان لے کر۔ ہم دونوں جھرنے کی طرف بڑھ گئے۔

بڑی خوب صورت جگہ تھی، جیسا کہ سجاتا نے بیان کیا تھا۔ صاف شفاف پانی گنگناتا ہوا، اور جنگلی پھولوں کے قطعے قطار اندر قطار اور ڈھلانوں پر دیودار کے پیڑ، اور بادل سفید بطخوں کی طرح آسمان پر تیرتے ہوئے۔ یکایک ایک آدمی جھرنے کے قریب سے اٹھا۔ میں نے دیکھا جہاں سے وہ اٹھا تھا، اس کے قریب ایک ایزل بھی اپنے لکڑی کے چوکھٹے کو لیے کھڑا تھا۔ میں نے اس آدمی کو پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو اپنی سہری فیاٹ میں سجاتا کے گھر آتا تھا۔

وہ آدمی مسکراتے ہوئے سجاتا کی طرف بڑھا: "بڑی دیر کر دی۔" اس کے منہ سے نکلا۔

سجاتا اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی لجاجت سے بولی "کیا کرتی ڈارلنگ کوئی گاڑی ہی نہیں ملی۔ بڑی مشکل سے ان کو میری طرف اشارہ کر کے، تیار کر کے یہاں تک آئی ہوں ـــــ یہ ہیں مسٹر اکرام، اور مسٹر اکرام! یہ ہیں میرے شوہر، نور شاہ۔"

نور شاہ نے زبردستی میرا ہاتھ کھینچ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا "آپ لنچ تک تو ٹھہریں گے نا ـــــ" میں نے اس کی آواز سنی اور پھر چند لمحوں کے لیے ساری وادی میری نگاہوں میں گھوم گئی۔

"شکریہ"۔ ایک پھنسی ہوئی آواز میرے گلے سے نکلی۔ پھر میں وادی میں سے مڑا اور اپنی ٹائیوٹا میں بیٹھ کر واپس ہو لیا۔

چلتے چلتے دیر تک سجاتا کا فاتحانہ قہقہہ میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

اکرام اللہ نے اتنا کہہ کر قصہ ختم کر دیا اور گلاس ختم کر دیا۔ پھر بار میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا:

"تو صاحب یہ ہے کل کی داستان۔ آئیے عورت کی بے وقوفی اور حماقت کو نوش کرتے ہوئے ایک جام اور پئیں۔ بیرہ ایک ڈبل ڈمپل اور لاؤ۔"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بھگت رام

ابھی ابھی میرے بچے نے میرے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو اپنے دانتوں تلے داب کر اس زور سے کاٹا کہ میں چلائے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے غصے میں آکر اس کے دو تین طمانچے بھی جڑ دیئے ہیں۔ بیچارہ اسی وقت سے ایک معصوم پلے کی طرح چلا رہا ہے۔ یہ ننھے کم بخت دیکھنے میں کتنے نازک ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے ان کے دانت یوں تو دودھ کے دانت ہوتے ہیں، لیکن کاٹنے میں گلہریوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ اس بچے کی معصوم شرارت سے معاً میرے دل میں بچپن کا ایک واقعہ ابھر آیا ہے۔ اب تک میں اسے بہت معمولی واقعہ سمجھتا تھا اور اپنی دانست میں میں اسے قطعاً بھلا چکا تھا۔ لیکن دیکھیے یہ لاشعور بھی کس قدر عجیب ہے۔ اس کے سہارے میں بھی کیسے کیسے عجائب مستور ہیں۔ بظاہر تو بات تھی کہ بچپن میں میں نے ایک دفعہ اپنے گاؤں کے ایک آدمی بھگت رام کے ہاتھ کا انگوٹھا چبا ڈالا تھا۔ اور اس نے مجھے طمانچے مارنے کے بجائے بیسیوں پیڑے کھلائے تھے اور بظاہر میں اس واقعہ کو اب تک بالکل بھول چکا تھا۔ لیکن ذرا اس بھان متی کے پٹارے کی بوالعجبی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ معمولی سا واقعہ ایک خوابیدہ ناگن کی طرح ذہن کے پٹارے میں دبا ہے اور جونہی میرا بچہ میری چھنگلیا کو دانتوں تلے دباتا ہے اور میں اسے پیٹتا ہوں، یہ پچیس تیس سال کا سویا ہوا ناگ بیدار ہو جاتا ہے اور پھن پھیلا کر میرے ذہن کی چار دیواری میں لہرانے لگتا ہے۔ اب کوئی اسے کس طرح مار بھگائے۔ اب تو اسے

دودھ پلانا ہوگا! خیر تو وہ واقعہ بھی سن لیجئے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے جب ہم لوگ رنگپور کے گاؤں میں رہتے تھے۔ رنگپور کا گاؤں تحصیل جوڑی کا صدر مقام ہے اس لیے اس کی حیثیت اب ایک چھوٹے موٹے قصبے کی ہے۔ لیکن جن دنوں ہم وہاں رہتے تھے۔ رنگپور کی آبادی بہت زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی ڈھائی تین سو گھر ہوں گے جن میں بیشتر گھر برہمنوں اور کھتریوں کے تھے۔ دس بارہ گھر جلاہوں اور کمہاروں کے ہوں گے پانچ چھ بڑھئی اتنے ہی چمار اور دھوبی اور یہی سارے گاؤں میں لے دے کے آٹھ دس گھر مسلمانوں کے ہوں گے لیکن ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس لیے یہاں تو ان کا ذکر کرنا بھی بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔

گاؤں کی برادری کے مکھیا لالہ کانشی رام تھے، یوں تو برہمنی سماج کے اصولوں کے مطابق برادری کا مکھیا کسی برہمن ہی کو ہونا چاہیے تھا اور پھر برہمنوں کی آبادی بھی گاؤں میں سب سے زیادہ تھی، اس پر برادری نے لالہ کانشی رام کو جو ذات کے کھتری تھے، اپنا مکھیا چنا تھا۔ پھر وہ سب سے زیادہ لکھے پڑھے تھے یعنی نئے شہر تک پڑھے تھے۔ جو خط ڈاکیہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اسے بھی وہ اچھی طرح پڑھ لیتے تھے۔ تمسک ہنڈی، نالش، سمن، گواہی، نشان دہی کے علاوہ نئے شہر کی بڑی عدالت کی سرکاروائی سے وہ بخوبی واقف تھے، اس لیے گاؤں کا ہر فرد اپنی ہر مصیبت میں چاہے وہ خود لالہ کانشی رام جی کی پیدا کردہ کیوں نہ ہو۔ لالہ کانشی رام جی کا سہارا ڈھونڈھتا تھا اور لالہ جی نے آج تک اپنے کسی مقروض کی مدد کرنے سے انکار نہ کیا۔ اسی لیے وہ گاؤں کے مکھیا تھے۔ گاؤں کے مالک تھے اور رنگپور سے باہر بھی دور دور تک جہاں تک دھان کے کھیت دکھائی دیتے تھے۔ لوگ ان کے گن گاتے تھے۔

ایسے شریف لالہ کا منجھلا بھائی تھا لالہ بانشی رام، جو اپنے بڑے بھائی کے نزدیک کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا لیکن گاؤں کے لوگ اسے اتنا اچھا .. نہیں سمجھتے تھے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کیونکہ اُس نے اپنے برہمن دھرم کو تیاگ دیا تھا اور گورو نانک جی کے چلائے ہوئے پنتھ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ اور ان کے شہر سے ایک نیک صورت نیک طینت۔ نیک سیرت، گرنتھی کو بلا کر اُسے گاؤں میں سکھ مت کے پرچار کے لیے مامور کر دیا تھا —

لالہ بانشی رام کے سکھ بن جانے سے گاؤں میں جھٹکے اور حلال کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں اور سکھوں کے لیے تو گو یہ ایک مذہبی سوال تھا لیکن بھیڑ بکریوں اور مرغے مرغیوں کے لیے تو زندگی اور موت کا سوال تھا۔ لیکن انسانوں کے نقار خانے میں جانوروں کی کون سنتا ہے۔

لالہ بانشی رام کے چھوٹے بھائی کا نام تھا بھگت رام۔ یہ وہی شخص ہے.. ... جس کا انگوٹھا میں نے بچپن میں چبا ڈالا تھا کس طرح یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا.... ابھی تو اس کا کردار دیکھیے.... یعنی کہ سخت لفنگا۔ آوارہ بدمعاش تھا یہ.... شخص۔ نام تھا بھگت رام لیکن دراصل یہ آدمی رام کا بھگت نہیں شیطان کا بھگت تھا۔ رنگ پور کے گاؤں میں آوارگی، بدمعاشی ہی نہیں، ڈھٹائی اور بے حیائی کا نام اگر زندہ تھا محض بھگت رام کے وجود سے ورنہ رنگپور تو ایسی شریف روحوں کا گاؤں تھا کہ غالباً فرشتوں کو بھی وہاں آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہوگا۔ نیکی۔ پاکیزگی اور.... عبادت کا ہلکا ہلکا سا نور گویا ہر ذی نفس کے چہرے سے چھنتا نظر آتا تھا۔ کبھی کوئی لڑائی نہ ہوتی تھی۔ قرضہ وقت پر وصول ہو جاتا تھا۔ ورنہ زمین قرق ہو جاتی تھی اور لالہ کانشی رام پھر روپیہ دے کر اپنے مقروض کو کام پر لگا دیتے تھے، مسلمان بچارے اتنے کمزور تھے اور تعداد میں اس قدر کم تھے کہ ان میں لڑنے کی ہمت نہ تھی۔ سب بیٹھے مسجدوں کے مناروں اور اُس کے کنگروں کو خاموشی سے تاکا کرتے کیونکہ گاؤں میں انہیں اذان دینے کی بھی ممانعت تھی۔ کمیروں اور اچھوتوں کا سارا دھندا دوجے لوگوں سے وابستہ تھا اور وہ چوں تک نہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ احساس بھی نہ تھا کہ زندگی اس کے

علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے بس جو ہے وہ ٹھیک ہے۔ یہی مسلمان سمجھتے تھے، یہی براہمن، یہی کھتری.... یہی چمار اور سب مل کر بھگت رام کو گالیاں سناتے تھے کیونکہ اُس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔

بھگت رام لٹھ گنوار تھا۔ بات کرنے میں اکھڑ دیکھنے میں اکھڑ گندہ... ناتراش، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے دانت۔ بتیسی ہر وقت کھلی ہوئی لبوں سے رال ٹپکتی ہوئی جب ہنستا تو بتیسی کے ساتھ مسوڑھوں کی بھی پوری پوری نمائش ہوتی۔ گاؤں میں ہر شخص کا سر گھٹا ہوا تھا اور ہر ہندو کے سر پر چوٹی تھی۔ لیکن بھگت رام نے بلوچوں کی طرح لمبے لمبے بال بڑھا لیے تھے اور چوٹی غائب تھی بالوں میں بڑی کثرت سے جوئیں ہوتیں۔ جنہیں وہ اکثر گھراٹ کے باہر بیٹھ کر چنا کرتا تھا۔ سرسوں کا تیل سر میں دو تین بار رچایا جاتا۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور بیچ میں سے سیدھی مانگ نکال کر اور زلفیں سنوار کر وہ سرِ شام گاؤں کے چشموں کا طواف کیا کرتا۔ اپنی ان بری حرکتوں سے کئی بار پٹ چکا تھا لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بڑی موٹی کھال تھی اس کی اور پھر میرا خیال ہے کہ اُس کے شعور میں ضمیر کی آگ کبھی روشن نہ ہوتی تھی وہ شرارہ ناپید تھا۔ جو حیوان کو انسان بنا دیتا ہے۔ بھگت رام سو فیصد حیوان تھا اور اسی لیے گاؤں والے براہمن اور کھتری، امیر اور غریب، ہندو اور مسلمان اور سنار اور چمار سب اُس سے نفرت کرتے تھے۔

لیکن چونکہ لالہ کانشی رام کا چھوٹا بھائی تھا اور بظاہر گاؤں کے سب سے بڑے گھر کا ایک معزز فرد۔ اس لیے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود گاؤں کے لوگ اس کے وجود کو اور اس کے وجود کی مذبوحی حرکات کو برداشت کرتے تھے اور آج تک کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن جب ہم رنگ پور میں آئے اس وقت بھگت رام کے بڑے بھائی نے پریشان ہو کر اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور رتی کا ایک گھراٹ اس کے سپرد کر دیا تھا جہاں بھگت رام کام کرتا تھا۔ اور وہ رات کو سوتا بھی وہیں تھا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کیونکہ گھراٹ تو دن رات چلتا ہے۔ نہ جانے کس وقت کسے آٹا پسانے کی ضرورت درپیش ہو اور وہ چادر میں یا بھیڑ کی کھال میں مکئی یا گندم کے دانے ڈالے گھراٹ پر چلا آئے اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ دن بھر میں جو گیہوں جمع ہوتا ہے یا جو اناج ابھی پسا نہیں جاتا وہ وہیں گھراٹ پہ دھرا رہتا ہے اور اس کی نگہبانی کے لیے بھی تو ایک آدمی کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ یہی سوچ کر لالہ کانشی رام کا گھراٹ گاؤں میں سب سے نامی گھراٹ تھا یعنی تقریباً سارے گاؤں کا اناج وہیں پسوایا جاتا تھا۔ ایک اور گھراٹ بھی تھا۔ لیکن بالعموم مسلمانوں، اچھوتوں اور کمیروں کے لیے اناج جہاں پسایا جاتا تھا۔ جب کبھی بڑا گھراٹ چلتے چلتے رک جاتا اور اس کی مست چکی کام کرنے سے انکار کر دیتی یا جب پاٹوں کی سطح پر پتھریلے دندانے بنانے کے لیے انہیں الٹا دیا جاتا تو اس صورت میں دوسرے گھراٹ والوں کو چند روز کے لیے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بصورتِ دیگر بڑے گھراٹ پر گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔

جب بڑا گھراٹ چلتا تھا۔ اُس وقت کسی مسلمان، کسی کمیرے، کسی اچھوت کی یہ جرأت نہ تھی۔ جرأت تو کیا کبھی اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کا اناج کبھی بڑے گھراٹ پر پس سکتا ہے۔ شروع شروع میں جب بھگت رام نے کام سنبھالا تو اس نے بھی چند روز تک یہی وطیرہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں اس کے مزاج کے لاأبالی پن نے بلکہ یوں کہیے کہ شیطانی پن نے زور مارا اور اس نے سوچا چھوت چھات کیا ہے اس میں۔ جو آئے آٹا پسا کر لے جائے۔ ان پتھر کے دو پاٹوں میں دھرا ہی کیا ہے اور یہ آخر اناج ہی تو ہے جسے کتا بھی کھاتا ہے اس سے گھراٹ کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا دوسرے گھراٹ کا حال جو پہلے ہی بہت پتلا ہے اور بھی پتلا ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ دوسرا گھراٹ بالکل ہی بند ہو جائے نہ جانے اس نے کیا سوچا۔

بہرحال اس نے کوئی ایسی ہی بری بات سوچی ہوگی جو اس نے گاؤں کے چماروں اور کمیروں کو بھی اپنے گھراٹ پر سے آٹا پسانے کی دعوت دی۔ پہلے تو لوگوں نے بڑی شدومد سے انکار کیا: بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے، کیا کہتے ہو لالہ، ہم رعیت ہیں، تم راجہ

ہو، یہ تمہارا گھراٹ ہے۔ ہمارا گھراٹ وہ ہے۔ ہم بھلا یہاں آٹا پسانے کیوں آئیں گے۔ بابا یہ کام ہم سے نہ ہوگا اور ہو جاتا ہے ہم سے۔ نام لے لو پر یہ کام ہم سے نہیں ہونے کا۔ لیکن بھگت رام نے آخر اپنی چال کی سے ان بیچاروں کو پھسلا ہی لیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اناج جو تھی، یہ گھراٹ پر لایا کریں گے اور وہیں پسایا کریں گے۔

بھلا ایسی بات بھی برادری میں چھپی رہ سکتی ہے۔ برادری میں اک کہرام مچ گیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر روز بھگت رام سے تکرار ہونے لگی۔ بگڑا آدمی تھا۔ اس پہ کہ انہیں سمجھ گیا ہنس ہنس کر ٹالتا گیا۔ برادری نے غصے میں آ کر حقہ پانی بند کر دیا۔ پھر ایک دن خود بیٹ گیا۔ یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے لالہ کانشی رام تک جا پہنچا۔ انہوں نے بھگت رام کو بلا کر ڈانٹا، سمجھایا بجھایا، ٹھنڈے دل سے نرمی سے بکتا کر باتیں کیں۔ اونچ نیچ سمجھائی لیکن جس دل میں کمینہ پن ہو وہ دھرم کرم کی بات کب سنے گا۔ بھگت رام نے اس کان سے سنی اس کان سے نکال دی پہلے جب بھگت رام اپنے گھر پر رہتا تھا اس کے لیے تھوڑی بہت روک ٹوک بھی تھی۔ یہ ڈر بھی تھا کہ بڑے بھائی کیا کہیں گے۔ لیکن اب تو وہ دن رات گھراٹ پر رہتا تھا۔ اب اُسے وہاں روکنے والا کون تھا۔ اب وہ خوب کھل کھیلا۔ انہی دنوں وہ بھنگ پینے لگا اور ایک مسلمان فقیر کے ہاں آنا جانا شروع کیا جو ان دنوں اپنی بیوی اور ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ندی کے کنارے ایک تکیے پر آ کر ٹھہرا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے۔ بھگت رام گھراٹ کے کام کاج سے غافل رہنے لگا اور دن کا بیشتر حصہ تکیے پر چرس اور گانجا پینے میں گزارنے لگا۔ بھائی نے بہتیرا سمجھایا خود گاؤں کے شریف مسلمانوں نے اُس پر فقیر کے آنے پہ کہے لیکن وہ تو کسی اور ہی نشے میں چور تھا۔ چند دن اور گزر گئے اور پھر پتہ چلا کہ بھگت رام نے نئے شہر جا کر اُس مسلمان فقیر کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے اور اسلام قبول کر لیا ہے سارے گاؤں میں ہلچل سی مچ گئی۔ جب انہوں نے بھگت رام کو سیاہ چھپنے والی سرخ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

رنگ کی اونچی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھا۔ فقیر تو خیر ڈر کے مارے پھر کبھی اس گاؤں میں گھسا ہی نہیں اور یہ اس نے اچھا کیا۔ ورنہ لالہ کانشی رام اور بانشی رام ضرور اُس سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے۔ لیکن اپنے بھائی کو اب وہ کیا کہہ سکتے تھے جو اپنی بیوی کو لے کر پھر گاؤں میں آ گیا تھا۔ اور گھراٹ میں اپنے بڑے بھائی کے گھراٹ میں آ کر بس گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہتے تھے اور . . . . .
بھگت رام اب بڑا خوش تھا اور سفید لٹھے کی شلوار اور سیاہ چکن کی واسکٹ جس پر کئی سو گھنڈی دار بٹن لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کی گلیوں میں فخریہ گھومتا تھا اور گاؤں کی بہو بیٹیوں پر بلا امتیاز مذہب و ملت آوازے کستا تھا۔ ایسا دس نمبر کا بدمعاش تھا وہ، کہ میری ماں جب مجھے گالی دیا کرتی تھیں تو میرے خصائل کا مقابلہ بھگت رام کے اوصافِ حمیدہ سے کیا کرتی تھیں اور میں ہمیشہ رو دیتا۔ بھگت رام سے مجھے سخت چڑ تھی۔ ایک تو اس نے ہمارا دھرم چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسے آدمی کا کیا اعتبار اور بھگت رام کی شیطنت دیکھو۔ مسلمان ہوتے ہی اس نے گاؤں کے مسلمانوں کو اکسانا شروع کیا کہ وہ مسجد میں منارے پر چڑھ کر اذان دیں۔ لیکن وہ تو بھلا ہو مسلمانوں کا، کسی نے اس کی بات نہیں مانی اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ گاؤں میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس پر وہ بدمعاش بہت ہنسا اور اس نے خود وضو کر کے مسجد کے منارے پر چڑھ کر اذان دی اور اُس کی گونجتی گرجتی ہوئی آواز نیچے کی وادی میں ندی کنارے ناشپاتیوں کے جھنڈ میں اور دُور دُور صنوبروں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی چھاتیوں میں دھمک پیدا کرتی ہوئی گونج گئی اور گاؤں کے ہر برہمن اور کھتری کا دل اِک نامعلوم خوف سے بھر گیا۔ گھور کلجگ ہے۔ گھور کلجگ ہے۔ یہ . . . . . اب کوئی دن ہیں ضرور نِشکلنکی اوتار پیدا ہوں گے، ہے رام . . . ہے رام . . . . اور لالہ کانشی رام نے برہمنوں سے مشورہ کر کے ایک بہت بڑا یگیہ کیا اور پرائشچت کیا اور اپنے چھوٹے بھائی بھگت رام کو برادری سے خارج اور جائداد سے بے دخل کر دیا اور پُرانے گھراٹ کے پانی کا بہاؤ موڑ کر ایک اور عمدہ سا گھراٹ

بنایا۔ پرانا گھراٹ جہاں اب بھگت رام اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ اب بڑی خستہ حالت میں تھا کیونکہ کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے مسلمانوں کے جو چند گھر باقی رہ گئے تھے انہوں نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ گاؤں کی سماجی زندگی میں بھگت رام نے جا بجا سوراخ کر دیے تھے اور اسے کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ کہ یہ فقیرن بیاہ سے پہلے ہی حاملہ تھی اور وہ فقیر بھگت رام کو جُل دے کر خود فرار ہو گیا تھا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہاں یہ بات ضرور سچ تھی۔ کہ بھگت رام ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی میں مصروف رہتا۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی محنت اور مشقت کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن گاؤں میں اب کوئی اسے کام دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور ایسے لوفر کے لیے بھلا اس شریف گاؤں میں کام کرنے کی کیا سبیل ہو سکتی تھی مجھے وہ رات نہیں بھولتی۔ جب بھگت رام کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا صبح ہی سے بھگت رام نے ہمارے گھر کے چکر لگانے شروع کیے تھے۔ میری ماں کی" . . . .
منتیں کی تھیں اور اُس کے پاؤں پر اپنا ماتھا ٹیک کر کہا تھا "تم چلو گی ماں تو میری بیوی بچ جائے گی" لیکن میری ماں نے جو بڑے بڑے کھتری گھرانوں اور برہمنوں کے گھروں میں دایہ بن کر جاتی تھی۔ بھگت رام کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ آدھی رات کے وقت بھگت رام نے چیخ چیخ کر دہائی دی لیکن ہم لوگوں نے دروازہ نہیں کھولا اور مست مار کر سو رہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ بھگت رام کی بیوی زچگی میں مر گئی۔ بچہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ بھگت رام بہت رویا۔ زار و قطار رویا لیکن وہ کوئی سچے آنسو تھوڑے تھے۔ کسی انسان کے آنسو تھوڑے تھے۔ ایک حیوان کے آنسو تھے۔ جو یونہی اپنی تکلیف پر ٹسوے بہا رہا ہو۔ کیونکہ چند دنوں میں ہی وہ اس فقیرنی کو بھول گیا تھا۔ اب اُس نے اپنا مسلمانی نام بھی ترک کر دیا تھا اب وہ پھر اپنے آپ کو خدا بخش نہیں بھگت رام کہتا تھا اور اسی طرح گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتا تھا۔ لیکن شاباش ہے ہندوؤں کو کہ کسی نے اُسے منہ نہیں لگایا۔ حتیٰ کہ اُس کے بھائی بھی اس سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہوئے اور

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بھگت رام اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ۔

چند روز کے بعد بھگت رام گاؤں چھوڑ کر کہیں دور چلا گیا ۔ تین چار مہینوں کے بعد جو لوٹا تو اُس کے پاس دو تین درجن سانپ تھے اور بہت سے چھچھوندر اور نیولے اور ایسے ہی بہت سے جانور ۔ ایک پنجرے میں ایک خوبصورت مینا تھی جو بہت اچھا گاتی تھی اور میں گھنٹوں اس مینا کے پنجرے کے قریب ہو کر سنا کرتا تھا اور گاؤں کے بہت سے لڑکے میری طرح بھگت رام کے پاس آیا کرتے اور اب بھگت رام کے پاس بہت سی جڑی بوٹیاں تھیں جن کے متعلق وہ کہتا تھا کہ دنیا کی ہر بیماری کو یوں چٹکی میں دور کر سکتی ہے ۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کی طرف کھنچنے لگے اور اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی ۔ میری ماں کو جو گاؤں کی مشہور دایہ تھیں اور عورتوں کے ہر روگ کا علاج جانتی تھیں ۔ بھگت رام کا یہ بہروپ بہت برا معلوم ہوا ۔ مگر وہ اب کیا کر سکتی تھیں ۔ ہاں جب کبھی ان دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی وہ اسے خوب کھری کھری سناتیں ۔ بھگت رام یہ صلواتیں سُن کر ہنس دیتا ۔ یا اپنا سر کھجانے لگتا اور پھر اک زور کا قہقہہ لگا کر آگے چل دیتا ۔ پرلے درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا وہ ۔۔ ۔۔ ۔۔

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ بھگت رام کی جڑی بوٹیوں کی دھاک سارے گاؤں میں بندھ گئی ۔ پھر قرب و جوار کے مریض بھی اس کے پاس آنے لگے اب اس نے گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک چمار کی آدھی دکان کرائے پر لے لی اور وہاں بیٹھ کر دوائیاں بیچنے لگا ۔ آدھی دکان میں مولو چمار جوتیاں بناتا تھا مولو چمار اور اس کی بیوی اور اس کی بیوہ بہن رام دئی ۔ بس یہ تینوں افراد ہر وقت جب دیکھو جوتیاں سیتے رہتے تھے ۔ دکان کے دوسرے حصے میں بھگت رام تھے گاہکوں کو پھانستا تھا اور سانپوں کا تماشا دکھاتا تھا اور اپنی زبان کو سانپوں سے ڈسواتا تھا اور خود سنکھیا کھا کر بتاتا تھا کہ اس پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس کے پاس ایسی تیر بہدف جڑی بوٹیاں تھیں جو ہر قاتل سے قاتل زہر کے

لیے تریاق کا حکم رکھتی ہیں ۔ الغرض اسی قسم کی جھوٹی گپیں ہانک کر اور شیخیاں بگھار کر وہ اُجڈ گنوار اور بھولے بھالے دیہاتیوں سے بٹورتا تھا اور میری ماں کو اس کی باتیں سُن سن کر بہت غصہ آتا تھا ۔ لیکن ہم لوگ اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے ۔ کیونکہ لوگوں کو اُس پر اعتقاد سا ہو گیا تھا اور اب اُس کے پاس روپے بھی تھے اور اس نے گاؤں سے باہر ندی کے اُس پار مٹی کا ایک کچا سا گھر بھی بنا لیا تھا ۔ جہاں وہ فرصت کے وقت اپنا چھوٹا سا باغیچہ بنانے میں مصروف ہوتا ۔ مجھے بھگت رام سے بڑی نفرت تھی اور میں کبھی اس کے گھر نہ جاتا تھا ۔ لیکن اب وہ اس خوبصورت مینا کو جو دکان کے باہر لٹکے ہوتے پنجرے میں گاتی رہتی تھی ، اپنے گھر لے گیا تھا اس لیے میں کبھی کبھی اس کے گھر محض اس مینا کو دیکھنے کے لیے چلا جایا کرتا ۔ خیریت ہوئی اس نے مجھے ٹوکا نہیں ۔ ورنہ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ اگر اُس نے مجھے کبھی ٹوکا تو گوپھنے میں ڈھیلا رکھ کر بھگت رام کا سر پھوڑ دوں گا ۔

بھگت رام کا کام اب ترقی پر تھا ۔ لیکن انہی دنوں اس نے ایسی حرکت کی گاؤں کے لوگ پھر اس سے بدظن ہو گئے اور اس واقعے کے بعد گاؤں میں اور قرب و جوار کے گاؤں میں کبھی اس کی ساکھ نہیں بندھی ۔ واقعہ دراصل یہ تھا ۔ کہ رام دئی ، جو کہ مولو چمار کی بیوہ بہن تھی اور لالہ بانشی رام کی داشتہ تھی اور ہر ممکن احتیاط کرنے کے باوجود حاملہ ہو گئی تھی ۔ اور لالہ بانشی رام نے در پردہ بھگت رام کو کہلا بھیجا تھا کہ وہ کوئی ایسی دوائی دے جس سے رام دئی کا حمل اسقاط ہو جائے ۔ لیکن بھگت رام تو ایک چھٹا ہوا تھا وہ بھلا ایسے موقعے پر کسی شریف آدمی کی کیوں کر مدد کرتا ۔ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا ۔ الٹا اس نے معاملے کی یہاں تک تشہیر کی لالہ بانشی رام کو چند ماہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر نئے شہر جانا پڑا اور رام دئی کے لیے منہ چھپانا مشکل ہو گیا ۔ یہ واقعہ اب اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ جب لالہ بانشی رام کے بڑے بھائی کانشی رام نے میری ماں کو جو اُن کی خاندانی دایہ تھی ۔ اس نازک معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کہا تو انہوں نے بھی صاف انکار

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچاری رام دئی نو مہینے اس حرامی بچے کو اپنے پیٹ میں لیے لیے پھری اور گاؤں بھر میں اس کی بے عزتی ہوئی اور حرامی بچہ اس نے الگ جنا اس پر اُس کی برادری نے اُسے "جات باہر" کر دیا اور اُس کے بھائی نے اور اُس کی بیوی نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا اس حالت میں جب اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اور جب وہ کئی دن سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی اور اپنے بچے کو دودھ دینے کے لیے خود اس کے تھنوں میں دودھ نہ رہا تھا۔ وہ بھگت رام کے گھر پہنچی۔ وہ بدمعاش تو جیسے اُس کے انتظار میں ہی تھا۔ اُس نے جھٹ اسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور بغیر کوئی شادی بیاہ کیے۔ یونہی وہ لوگ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ گاؤں میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا یہ اندھیر گردی —— یہ بے راہروی —— بے شرمی، بے حیائی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگت رام کی دکان اٹھوا دی گئی اور اُسے اچھی طرح جتا دیا گیا کہ اس واقعے کے بعد اگر وہ کبھی گاؤں کا رخ کرے گا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

بھگت رام اب اپنے گھر ہی میں رہتا تھا اور باغیچے اور گھر کے آس پاس جو اس نے تھوڑی سی زمین مول لی تھی اس میں کاشت کر کے اپنا اور رام دئی اور اس کے حرامی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑی اداس زندگی بسر کرتا ہے یہ خیال بالکل غلط ہے جیسے چکنے گھڑے پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان تمام واقعات نے بھگت رام کی فطرت پر کوئی اثر نہیں کیا۔ اس کی سرشت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اُسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس نے کوئی گناہ بھی کیا ہے۔ اُسے اس امر کا خیال ہی نہیں تھا کہ اُس نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے ماں باپ، اپنے خاندان، اپنے گاؤں کی عزت کو بٹہ لگایا ہے وہ اُسی طرح خوش و خرم اور شاداں و فرحاں نظر آتا تھا کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔۔ جیسے وہ اب بھی گاؤں کے اندر اپنے بھائی کے خوبصورت گھر میں جس کی چھت ٹین کی تھی

رہتا ہو۔ میں نے ایک دن اُسے اس کے گھر میں دوپہر کے وقت دیکھا تھا۔ وہ آنگن میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور رام دئی کو چوم رہا تھا میں نے اس سے پہلے کسی مرد اور عورت کو چومتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے یہ منظر دیکھ کر میں تو اک دم بھونچکا رہ گیا اور میرے کانوں میں ایک دم میری ماں کے الفاظ گونجے "کبھی بھول کر بھی بھگت رام کے گھر کا رُخ نہ کرنا۔ وہ بڑا ہی .. .. .. بدمعاش ہے"۔ میری ماں نے سچ کہا تھا۔ بھلا شریف لوگ کہیں ایسے ہوتے ہیں غم و غصے سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں واپس جانے کو تھا کہ مینا نے مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے چلانے لگی "آؤ آؤ ننھے منے بالک مٹھائی دوں گی"۔ مینا کی آواز سن کر بھگت رام جلدی سے اٹھا اور میری طرف بڑھا، شاید وہ مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ بدمعاش میں تیرے قابو میں آسانی سے نہیں آؤں گا، ڈاکو میں روتا ہوا آگے آگے بھاگا۔ پیچھے پیچھے بھگت رام دوڑتا ہوا آ رہا تھا کہہ رہا تھا "بات تو سُن، بیٹے، بات تو سُن بیٹے"۔ پر میں ایسا بیوقوف نہ تھا کہ رک جاتا میں بھاگتا گیا۔ یکایک اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور میں نے کٹکٹا کر اس کے انگوٹھے کو اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور اتنے زور سے کاٹا کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا مگر اس نے مجھے طمانچے نہیں مارے کچھ نہیں کیا۔ لیکن مجھے چھوڑا بھی نہیں وہ مجھے اپنے گھر کے آنگن میں لے گیا۔ مجھے گردن سے پکڑے ہوئے تھا کم بخت میں اب بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے رام دئی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ تمہاری موسی ہیں انہیں رام رام کہو"۔

میں نے کہا "موسی تمہاری ہوگی۔ میں انہیں رام رام نہیں کہوں گا"۔

اس نے ہنس کر کہا "دیکھو یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ منو اس کے ساتھ کھیلو"۔

میں نے کہا "میں اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ میری ماں کہتی ہیں کہ رام دئی کا بچہ حرامی ہے۔ حرامی ہے یہ بچہ . . . . . . !"

معاً رام دئی نے بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ بھگت رام کھلکھلا کر ہنس پڑا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اور اس کے بدصورت کریہہ دانت اور مسوڑھے ہونٹوں کے باہر نکل آئے، کہنے لگا "سیب کھاؤ گے؟ سیب کھاؤ گے؟ آلوچے؟ آلوچے؟ ہاہاہا!"

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

اس نے زبردستی بہت سے سیب اور آلوچے میری جیبوں میں ٹھونس دیے پھر مسکرا کر بولا "یہ مینا تمہیں اچھی لگتی ہے نا۔ لے جاؤ اسے"۔

وہ پنجرا اتار کر میرے حوالے کرنے لگا۔

میں نے کہا: "کوئی تھوکتا بھی ہے اس تمہاری مینا پر۔ میری ماں کہتی ہیں کہ بھگت رام آدمی نہیں حیوان ہے۔ وہ چمار سے بھی بدتر ہے، چھوڑو مجھے۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہاری مینا وینا......"

اس نے ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ کہنے لگا "تو اب بھاگ جاؤ"۔

اُس بدمعاش کے پنجے سے نکل کر جو میں بھاگا بھاگا تو سیدھا گھر آکے دم لیا گھر آکر ماں کو جو میں نے سارا قصہ سنایا تو پہلے تو مجھ پر بہت بگڑیں۔ پھر بھگت رام کو انہوں نے خوب خوب کوسا اور سارے سیب اور آلوچے اٹھا کر گلی میں پھینک دیے۔

اس کے بعد میں کبھی بھگت رام کے گھر پر نہیں گیا۔

چند مہینوں کے بعد جب لالہ بانشی رام نئے شہر سے لوٹا تو اس نے مولو چمار سے کہہ سن کر بھگت رام پر بدچلنی اور اغوا کا مقدمہ دائر کرا دیا چھ سات مہینے بھگت رام جیل میں رہا۔ آخر کار وہ بری ہو گیا۔ لیکن جیل میں رہ کر اس کی صحت کافی کمزور ہو گئی تھی اور اب وہ جیل سے چھوٹ کر آیا تو لوگ کہتے تھے کہ اس کے چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی۔ نہ وہ اب پہلے کی طرح سینہ تان کر چلتا تھا کچھ جھکا جھکا سا تھا۔ کچھ اداس اداس لیکن یہ کیفیت بھی چند روز تک رہی پھر وہ اسی طرح ڈھیٹ بے شرم، بے حیا بن کر ادھر ادھر گھومنے لگا اور تاڑی کی

جا کر اپنی جڑی بوٹیوں کی تجارت کرنے لگا۔ لیکن شریف لوگ اسے منہ نہیں لگاتے تھے اور اس کے سائے سے پرہیز کرتے تھے۔ ہندو مسلمان عیسائی ہر مذہب اور ہر جات کے لوگ اسے آوارہ اور شہدہ سمجھتے تھے اور ہمارے گاؤں میں تو اس کی برائی ضرب المثل بن چکی تھی اور مائیں ہمیں درس اخلاق دیتے وقت کہا کرتی تھیں "دیکھو جی، اگر کوئی برا کام کرو گے تو تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو بھگت رام کا ہوا ہے"۔

جیسی بے معنی، بے مطلب اس کی زندگی تھی۔ ویسی ہی اس کی موت تھی۔ بالکل مہمل، لامعنی.....

میں نے اُسے مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن جن لوگوں نے اُسے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ بھی اس کے پاگل پن پر آج تک ہنستے ہیں۔ کہتے ہیں۔ مرنے سے پہلے وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ندی کے کنارے رام دتی کے ساتھ کھڑا تھا اور اُن طوفانی لہروں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جو برساتی بارش کی وجہ سے ندی کی سطح کو گرداب فنا بنائے ہوئے تھیں۔ یکایک اس نے اپنے کنارے کے قریب بھیڑ کے تین چار بچوں کو دیکھا جو ان ہلاکت آفریں لہروں کی گود میں خوفزدہ آواز میں ابا ابا کہتے ہوئے بہتے چلے آرہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھگت رام نے ان کی طرف دیکھا دوسرے لمحے میں وہ ندی کی طوفانی لہروں کی آغوش میں تھا اور بھیڑ کے بچوں کو بچانے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ اسی کوشش میں اس نے اپنی جان بھی دے دی۔ دوسرے دن جب طوفان تھم گیا تو اُس کی لاش ندی کے غربی موڑ پر تنک کے ایک تنے سے لپٹی ہوئی پائی گئی جس کا آدھا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا کیسی جاہلانہ، احمقانہ، بیوقوفانہ موت تھی یہ۔ حیوانی زندگی حیوانی موت، حسنِ ترتیب اور حسنِ توازن سے عاری بھلا ایسی موت بھی کوئی تک ہے..... لیکن اس کے اچھے بھائیوں نے اچھا کیا۔ اسے معاف کر دیا اور گو وہ برادری سے خارج ہو چکا تھا اور اب وہ نہ ہندو رہا نہ مسلمان نہ اچھوت، پھر بھی انھوں نے اپنے دھرم

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کے مطابق اس سے اچھا سلوک کیا وہ اس کی لاش گھیرے گئے۔ اُسے نہلایا دھلایا۔ .... اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اسے شمشان گھاٹ لے جا کر آگ لگا دی میں اُس وقت وہیں موجود تھا ....

لیکن یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ آج ۱۹۴۲ء ہے اور میرے ننھے بچے نے میری چھنگلیا کو زور سے کاٹ کھایا ہے اور میں نے غصّے میں آ کر اسے دو تین طمانچے جڑ دیے ہیں اور معصوم بچہ صوفے میں منہ چھپائے رو رہا ہے اور میں سوچتا ہوں، آج میں یہ سوچتا ہوں بھگت رام کہ تم جو دس نمبر کے بدمعاش تھے اور تمہارا کوئی مذہب نہ تھا، تم جو ایک گنوار اُجڈ، جھوٹے پنساری تھے اور جڑی بوٹیاں بیچتے تھے اور لوگوں کو ٹھگتے تھے اور اُن سے دو پیسہ بٹورتے تھے اور ایک مسلمان فقیرنی سے نکاح کیے ہوئے تھے اور ایک اچھوت بیوہ سے جھوٹ موٹ کا بیاہ رچائے ہوئے تھے بھگت رام تم جو جیل کی ہوا کھا چکے تھے اور گاؤں بھر کے مانے ہوئے لفنگے اور غنڈے تھے ..... تم جس سے لوگ نفرت کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں ایک میرے گاؤں میں ہی نہیں، ہر گاؤں میں، ہر شہر میں، ہر جگہ میں ..... آج میں یہ سوچتا ہوں بھگت رام شاید میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ شاید میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی، شاید تم ان تمام بڑے آدمیوں سے بڑے ہو، اچھے ہو، بہتر ہو جو ملیں بناتے ہیں اور لوگوں کو بھوکا مر جانے دیتے ہیں جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں

اور خدا کی مخلوق کو گلیوں میں پھرنے پر مجبور کرتے ہیں جو نادار عورتوں سے ان کی عصمت چھین کر عصمت پرست بنتے ہیں جو اپنی وقتی بیویوں کے لیے قحبہ خانے اور اپنی اولاد کے لیے یتیم خانے تعمیر کرتے ہیں اور سماج کے مندر میں بیٹھ کر ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ہاں تم اُن سب آدمیوں سے بڑے ہو جو ٹریکٹر، ہوائی جہاز، سکول، مشین گن، تھیٹر، سینما، ایمپائر بلڈنگ، ناچ گھر، بنک، یونیورسٹی، سلطنت، تختِ طاؤس، کتبے، آپنشد، فلسفہ، زبان اور ادب کی تخلیق کرتے ہیں

اور آدمی کی نسل کو کائنات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیران و پریشان چھوڑ دیتے ہیں تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو، اچھے ہو بھگت رام کیونکہ تم پنساری ہو جڑی بوٹیاں فروخت کرتے ہو۔ آوارہ مزاج ہو لیکن نہیں تم سچ مچ شاعر ہو۔ بھگت رام، تم وہ شاعر ہو جو ہر صدی میں ہر برس میں، ہر جگہ، ہر گاؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اچھے لوگ، نیک لوگ بڑے لوگ اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں تم وہ شاعر ہو دوست آؤ ... ہاتھ ملاؤ!

لیکن بھگت رام اب مجھ سے ہاتھ نہیں ملا سکتا کیونکہ وہ مر چکا ہے ۱۹۳۰ء کی طغیانی میں بھیڑ کے بچوں کو بچاتے ہوئے مر گیا تھا اور وہیں ندی کے کنارے اس کی چتا سے شعلے بلند ہو کر آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لال لال شعلے، شعلوں کے پتے شعلوں کی کلیاں، شعلوں کے پھول اس کی چتا سے کھل رہے تھے اور چتا جل رہی تھی اور کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے اور قدرت بھی اداس نہ تھی۔ آسمان صاف تھا۔ نیلا گہرا، خوبصورت، دھوپ بھی صاف تھی کھلی، ہوئی چمکدار، نرم اور گرم اور کہیں کہیں بادلوں کے سپید سپید سبک اندام راج ہنس تیر رہے تھے اور ندی کا پانی گیت گاتا ہوا، بھنور بناتا ہوا، لہروں کے جال تنتا ہوا اس کی چتا کے قریب سے گزر رہا تھا اور چتا کے پاس ہی کھڑے املتاس کے جھنڈ میں شعلہ بداماں پھول دہک رہے تھے کائنات خوش تھی۔ خدا خوش تھا خود شاعر خوش تھا کیونکہ آج اس کا دل شعلہ بن گیا تھا۔ اور اس کی دفعہ پھول یہ شعلے جو تمہارے دل میں ہیں۔ یہ پھول جو ہر جگہ ہیں۔ تمہارے اندر ہیں اور میرے اندر ہیں اور پھر اندر اور باہر، سب جگہ، ہر جگہ، کائنات اور شاعر اور آدمی ایک ہو گئے تھے۔ ایسی موت کسے نصیب ہوتی ہے۔

بھگت رام! .....

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کچرا بابا

جب وہ ہسپتال سے باہر نکلا، تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور اس کا سارا جسم بھیگی ہوئی رُوئی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کا جی بیٹھنے کو وہیں چاہتا تھا۔ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ جانے کو چاہتا تھا۔

قاعدے سے اُسے ابھی ایک ماہ اور ہسپتال میں رہنا چاہیے تھا مگر ہسپتال والوں نے اس کی چھٹی کر دی تھی۔ ساڑھے چار ماہ تک وہ ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں رہا تھا اور ڈیڑھ ماہ تک جنرل وارڈ میں۔ اس اثنا میں اس کا ایک گردہ نکال دیا گیا تھا اور اس کی آنتوں کا ایک حصہ کاٹ کے آنتوں کے فعل کو درست کیا گیا تھا۔ ابھی اس کے کلیجے کا فعل راست نہیں ہوا تھا کہ اُسے ہسپتال سے نکل جانا پڑا، کیوں کہ دوسرے لوگ انتظار کر رہے تھے، جن کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا نسخہ دے دیا اور کہا "یہ ٹانک پیو اور مقوی غذا کھاؤ۔ بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔ اب ہسپتال میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

"مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا، ڈاکٹر صاحب" اس نے کمزور آواز میں احتجاج کیا۔

"گھر جاؤ، چند دن بیوی خدمت کرے گی، بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے!"

بہت ہی دھیرے دھیرے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلتے اس نے سوچا، گھر! —— مگر میرا گھر ہے کہاں؟

چند ماہ پہلے میرا ایک گھر ضرور تھا۔ ایک بیوی بھی تھی، جس کے ایک بچہ ہونے والا تھا۔ وہ دونوں اس آنے والے بچے کے تصور سے کس قدر خوش تھے۔ ہوگی دنیا میں زیادہ آبادی، مگر وہ تو ان دونوں کا پہلا بچہ تھا۔ اور ان کی حیرت اور مسرت سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بچہ دنیا کا سب سے پہلا بچہ ہوگا۔

دُلاری نے اپنے بچے کے لیے بڑے خوب صورت کپڑے سیئے تھے، اور ہسپتال میں لا کر اُسے دکھائے تھے اور ان کپڑوں کی نرم سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر اس سے پیار کر رہا ہے۔

مگر پھر اگلے چند مہینوں میں بہت کچھ لٹ گیا۔ جب اس کے گردے کا پہلا اپریشن ہوا تو دُلاری نے اپنے زیور بیچ دیے کہ ایسے ہی موقعوں کے لیے ہوتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زیور عورت کے حُسن کی افزائش کے لیے ہوتے ہیں، وہ تو کسی دوسرے درد کا مداوا ہوتے ہیں، شوہر کا اپریشن، بچے کی تعلیم، لڑکی کی شادی یہ بنک ایسے ہی موقعوں کے لیے کھلتا ہے اور خالی کر دیا جاتا ہے۔ عورت تو اس زیور کی تحویل دار ہوتی ہے اور زندگی میں مشکل سے پانچ چھ بار اسے اس زیور کو پہننے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

گردے کے دوسرے اپریشن سے پہلے دُلاری کا بچہ ضائع ہو گیا۔ وہ تو ہوتا ہی۔ دُلاری کو دن رات جو کڑی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس میں یہ خطرہ سب سے پہلے موجود تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دُلاری کا یہ چھریرا سُنہرا بدن اس قدر کڑی مشقت کے لیے نہیں بنایا گیا ہے، اس لیے وہ دانا و فرزانہ بچہ بیچ ہی میں سے کہیں کھسک گیا تھا۔ ناسازگار ماحول دیکھ کر اور ماں باپ کی پتلی حالت بھانپ کر اس نے خود ہی پیدا ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ بعض بچے ایسے ہی عقلمند ہوتے ہیں!

دُلاری، کئی دنوں تک ہسپتال نہیں آ سکی، اور جب اس نے آ کے خبر دی تو وہ کس قدر رویا تھا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ آگے چل کے اسے اس سے کہیں زیادہ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

رونما ہونے لگا تو وہ اس حادثے پر رونے کے بجائے خوشی کا اظہار کرتا۔

گردے کے دوسرے آپریشن کے بعد اس کی نوکری جاتی رہی۔ طویل علالت میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی کہاں تک انتظار کر سکتا ہے۔ بیماری انسان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے اس لیے وہ اگر چاہتا ہے کہ اس کی نوکری قائم رہے، تو اسے زیادہ دیر تک بیمار نہ پڑنا چاہیئے۔ انسان مشین کی طرح ہے۔ اگر ایک مشین طویل عرصے کے لیے بگڑی رہتی ہے تو اسے اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نئی مشین آجاتی ہے۔ کیونکہ کام رک نہیں سکتا۔ بزنس بند نہیں ہو سکتا اور وقت تھم نہیں سکتا۔ اس لیے جب سے معلوم ہوا کہ اس کی نوکری بھی جاتی رہی ہے تو اسے شدید دھچکا سا لگا۔ جیسے اس کا دوسرا گردہ بھی نکال لیا گیا ہو۔ اس دھچکے سے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ اصلی اور بڑی مصیبت میں آنسو بھی نہیں آتے۔ اس نے محسوس کیا، صرف دل کے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ زمین قدموں کے نیچے سے کھسکتی معلوم ہوتی ہے اور رگوں میں خون کے بجائے خوف دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کئی دن تک وہ آنے والی زندگی کے خوف اور دہشت سے سو نہیں سکا تھا۔ طویل علالت کے خرچے بھی طویل ہوتے ہیں۔ طور زیربار کرنے والے۔ ہولے ہولے گھر کی سب قیمتی چیزیں چلی گئیں۔ مگر دلاری نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے ساڑھے چار ماہ تک اپنے شوہر کو پرائیویٹ وارڈ میں رکھا۔ اس کا بہترین علاج کیا۔ اپنے گھر کی ایک ایک چیز بیچ دی اور آخر میں نوکری بھی کر لی۔ وہ ایک فرم میں ملازم ہو گئی تھی۔ اور ایک روز اپنی فرم کے مالک کو لے کر ہسپتال بھی آئی تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا، کوتاہ قد، ادھیڑ عمر کا شرمیلا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ کم گو، اور میٹھی مسکراہٹ والا۔ صورت شکل سے وہ کسی بڑی فرم کا مالک ہونے کے بجائے کتابوں کی کسی دکان کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ دلاری اس کی فرم میں دو سو روپے مہینے پر نوکر ہو گئی تھی۔ چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، اس لیے اس کا کام لفافوں پر ٹکٹیں لگانا تھا۔

"یہ تو بہت آسان کام ہے۔" دلاری کے شوہر نے کہا۔

فرم کا باس بولا "کام تو آسان ہے، مگر جب دن میں پانچ چھ سو خطوں پر ٹکٹیں لگانا پڑیں تو اسی طرح کا بہت آسان کام بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

دلاری نے مسکرا کر کہا "واقعی بہت تھک جاتی ہوں۔"

اور فرم کے باس نے اس سے کہا "اچھے ہو جاؤ، تو تم اپنی بیوی کے بجائے ٹکٹیں لگایا کرنا۔ میں یہ کام تمہیں سونپ دوں گا۔"

جب فرم کا باس جانے لگا تو دلاری بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا، کہ آج دلاری کے قدموں کی چاپ میں ایک عجیب خود اعتمادی سی ہے۔ اس کا جسم کسی پھولدار شاخ کی طرح لچک رہا ہے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے باس نے دلاری کے لیے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر وہ مؤدب ہو کر دلاری کو دروازے سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہوئے ذرا سا جھکا اور ایک لمحے کے لیے اس کا دوسرا ہاتھ دلاری کی کمر پر ایک ثانیے کے لیے رکا اور دلاری کے شوہر کو فرم کے باس کے پہلے ہاتھ کی حرکت تو پسند آئی لیکن پھر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ سمجھا لیا کہ کبھی کبھی ایک ہاتھ جو کرتا ہے وہ دوسرے ہاتھ کو معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں کو دھوکا ہوا ہو۔ محض ایک واہمہ۔ اس لیے اس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور نرم نرم تکیوں پر سر ٹکا کر گلوکوز کے انجکشن کا انتظار کرنے لگا۔

اس کا تیسرا آپریشن ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ہوا تھا۔ اس وقت تک دلاری فرم کے باس کے ساتھ دارجلنگ جا چکی تھی۔ آخر کوئی کب تک صبر کر سکتا ہے۔ زندگی مختصر ہے اور زندگی بہار اس سے بھی مختصر ہوتی ہے۔ جب جذبے بلاتے ہیں اور آنکھوں میں چاند اتر آتے ہیں۔ جب انگلیوں میں شعلوں کا سا لمس محسوس ہوتا ہے اور سینے میں میٹھا میٹھا سا درد ہوتا ہے جب بوسے بھنوروں کی طرح لبوں کی پنکھڑیوں پر گرتے ہیں اور گردن کے صراحی دار خم کسی کی گرم گرم سانس کی مدھم مدھم آنچ کو ترستے ہیں، ایسے میں کوئی کب تک فینائل اور پیشاب کی بو سونگھے، تھوک اور پیپ اور لہو کا رنگ دیکھے اور موت کے دروازے تک جاتی ہوئی اور لوٹ کر آتی ہوئی سسکیاں سنے؛

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

آخر قوتِ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، اور بیس برس کی لڑکی کی قوتِ برداشت بھی کیا؟ جس کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے اور جس نے اپنے شوہر کے ساتھ مصیبتوں کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہ تھا وہ اگر اپنے سپنوں کی ڈور سے بندھی بندھی دارجنگ چلی جائے تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟

اور وہ اس منزل سے گزر چکا تھا جب وہ کسی کو قصوروار ٹھہرا سکتا تھا۔ اتنی چوٹیں پے در پے اس پر پڑی تھیں کہ وہ بالکل بولا گیا، بالکل سناٹے میں آ گیا وہ بالکل دم بخود تھا۔ اب اس کی مصیبت اور تکلیف میں کسی طرح کا کوئی جذبہ یا آنسو نہیں رہ گیا تھا۔ بار بار ہتھوڑے کی ضربیں کھا کھا کر اس کا دل دھات کے ایک پترے کی طرح بے حس ہو گیا۔ اسی لیے آج جب اسے ہسپتال سے نکالا گیا تو اس نے ڈاکٹر سے کسی ذہنی تکلیف کی شکایت نہیں کی تھی۔ اس نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ اب وہ اس ہسپتال سے نکل کر کہاں جائے؟ اب اس کا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی بیوی نہیں، کوئی بچہ نہیں، کوئی نوکری نہیں، اس کا دل خالی تھا۔ اس کی جیب خالی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک خالی اور سپاٹ مستقبل تھا۔

مگر اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے صرف یہ کہا تھا "ڈاکٹر صاحب مجھ سے چلا نہیں جاتا!"

بس یہی ایک حقیقت تھی جو اسے اس وقت یاد تھی، باقی ہر بات اس کے دل سے محو ہو چکی تھی۔ اس وقت چلتے چلتے وہ صرف یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کا جسم گیلی روئی کا بنا ہوا ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کسی پرانی شکستہ چارپائی کی طرح چیخ رہی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے، روشنی نشتر کی طرح چبھتی ہے، آسمان پر ایک میلے اور پیلے رنگ کا وارنش پھرا ہوا ہے اور فضا میں تاریک ٹکڑے اور چتیاں سی غلیظ مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی ہیں اور لوگوں کی نگاہیں بھی گندے لہو اور پیپ کی طرح اس کے جسم سے چپک کر رہ جاتی ہیں۔ اسے بھاگ جانا چاہیے۔ کہیں پران لمبے لمبے بجلی کے تاروں والے کھمبوں اور ان کے درمیان گڈمڈ

ہونے والے راستوں سے کہیں دور بھاگ جانا چاہیے اور اسے اپنی ماں کی یاد آئی جو مر چکی تھی۔ اپنا آپ یاد آیا جو مر چکا تھا۔ اپنا بھائی یاد آیا جو افریقہ میں تھا۔ سن سن سن ایک ٹرام اس کے قریب سے گزرنے لگی۔ ٹرام کی برقی چھڑی بجلی کے تاروں سے گھسٹتی ہوئی گویا اس کے جسم کے اندر گھستی چلی جا رہی تھی اور پوری ٹرام کو اپنے جسم کے اندر چلتا ہوا محسوس کر سکتا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی انسان نہیں ہے ایک گھسا پٹا راستہ ہے۔

دیر تک وہ چلتا رہا۔ ہانپتا رہا اور چلتا رہا۔ اندازے سے ایک موہوم سمت کی طرف چلتا رہا۔ جدھر کبھی اس کا گھر تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اب اس کا کوئی گھر نہیں ہے، مگر وہ جاتے ہوئے بھی ادھر ہی چلتا رہا۔ گھر جانے کی عادت سے مجبور ہو کر۔ مگر دھوپ بہت تیز تھی اور اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور وہ راستہ بھول گیا۔ اور اب اس کے جسم میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ کہ وہ کسی مسافر سے راستہ ہی پوچھ لے۔ معلوم کرے یہ شہر کا کونسا حصہ ہے۔ ہوتے ہوتے اس کے کانوں میں ٹراموں اور بسوں کا شور بڑھنے لگا۔ نگاہوں میں دیواریں ٹیڑھی ہونے لگیں، عمارتیں گرنے لگیں، بجلی کے کھمبے گڈمڈ ہونے لگے۔

پھر اس کی آنکھوں تلے اندھیرا اور قدموں تلے ایک بھونچال سا آیا اور وہ یکایک زمین پر گر پڑا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو رات ہو چکی تھی، ایک نیم خنک سا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جس جگہ پر وہ گرا تھا اب تک وہ وہیں پر لیٹا ہوا ہے۔ یہ فٹ پاتھ ایک ایسا تھا جس کے عقب میں دو طرفہ دو دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار فٹ پاتھ سے لگی لگی سیدھی شمال سے جنوب کو چلی گئی تھی۔ دوسری شمال سے مغرب کو، اور وہ دونوں دیواروں کے اتصال پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں دیواریں کوئی چار فٹ کے قریب بلند تھیں یہاں پر امرود اور جامن کے پیڑ تھے اور ان پیڑوں کے پیچھے کیا تھا وہ اسے اس وقت نظر

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف مغربی دیوار کے سامنے پچیس تیس فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر ایک پرانی عمارت کا عقب تھا۔ سہ منزلہ عمارت تھی۔ اور ہر منزل میں پیچھے کی طرف رُخ ایک کھڑکی تھی اور چھ بڑے بڑے عقبی پائپ تھے۔ عقبی پائپ اور مغربی دیوار کے بیچ میں پچیس تیس فٹ چوڑی ایک اندھی گلی بن گئی تھی جس کے تین طرف دیوار تھی اور چوتھی طرف سڑک تھی۔ کہیں دور کسی گرجے کے گھنٹے نے رات کے تین بجائے اور وہ فٹ پاتھ پر لیٹا لیٹا اپنی کہنیوں پر زور دے کر ذرا سا اوپر اٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ سامنے کی دکانیں بند تھیں اور فٹ پاتھ کے اندھے سائبانوں میں کہیں کہیں بجلی کے کمزور بلب جھلملا رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے اُسے یہ ٹھنڈی تاریکی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا شاید وہ کسی مہربان سمندر کے پانیوں میں ڈوب رہا ہے۔

مگر اس احساس سے وہ اپنے آپ کو صرف چند لمحوں تک دھوکا دے سکا کیونکہ اب اس پر شدید بھوک طاری ہو چکی تھی۔ چند لمحوں کی خوشگوار خنکی کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ وہ شدید طور پر بھوکا ہے۔ جب سے اس کی آنتوں کا اپریشن ہوا تھا اسے بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس نے سوچا کہ ڈاکٹروں نے اس کی آنتوں کے فعل کو بیدار کر کے اس کے ساتھ کسی طرح کی بھلائی نہیں کی ہے۔ اس کے معدے کے اندر عجیب اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ اور آنتیں اندر ہی اندر تڑپ تڑپ کر روٹی کا سوال کر رہی تھیں اور اس وقت اس کے نتھنے کسی شہری انسان کے نتھنوں کی طرح نہیں بلکہ کسی جنگلی جانور کے نتھنوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ عجیب عجیب سی بوئیں اس کی ناک میں آ رہی تھیں۔ بوؤں کی ایک سمفنی تھی جو اس کے احساس پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس سمفنی کے ایک ایک سُر کا الگ الگ وجود پہچان سکتا تھا۔ یہ جامن کی خوشبو ہے۔ یہ امرود کی، یہ رات کی رانی کے پھولوں کی، یہ تیل میں تلی ہوئی پوریوں کی، یہ پیاز اور لہسن میں بگھارے ہوئے آلوؤں کی، یہ مولی کی، یہ ٹماٹر کی، یہ کسی سڑے ہوئے پھل کی، یہ پیشاب کی، یہ پانی میں بھیگی

ہوئی مٹی کی جو غالباً بانسوں کے جھنڈ سے آ رہی تھی، وہ ہر بو کی نوعیت، شدت، سمت اور فاصلے تک کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یکایک اسے یہ احساس بھی ہوا، اور وہ اس بات پر چونکا بھی کہ کس طرح بھوک نے اس کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ مگر اس امر پر زیادہ غور کیے بغیر اس نے اس طرف گھسٹنا شروع کر دیا، جدھر سے اُسے تیل میں تلی پوریوں اور لہسن سے بگھارے ہوئے آلوؤں کی بو آ رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اندھی گلی کے اندر گھسٹنے لگا کیونکہ وہ اپنے جسم میں چلنے کی سکت بالکل نہیں پاتا تھا۔ ہر لحظہ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ گہرے پانیوں میں ڈوب رہا ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی دھوبی اس کی آنتوں کو پکڑ کر مروڑ رہا ہے۔ پھر اس کے نتھنے میں پوریوں اور آلو کی اشتہا آمیز بو آتی اور وہ بے قرار ہو کر اور وہ مندھی آنکھوں سے اپنے تقریباً بے جان سے جسم کو ادھر گھسیٹنے کی کوشش کرتا۔ جدھر سے آلو، پوری کی بو آ رہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد جب وہ اُس جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مغربی دیوار اور اس کے سامنے کی عمارت کے پچھواڑے کے پائپوں کے درمیان پچیس تیس فٹ کے فاصلے میں مستطیل نما کچرے کا ایک بہت بڑا کھلا آہنی ٹب رکھا ہے۔ یہ ٹب کوئی پندرہ فٹ چوڑا ہوگا اور تیس فٹ لمبا اور اس میں طرح طرح کا کوڑا کرکٹ بھرا ہے گلے سڑے پھلوں کے چھلکے اور ڈبل روٹیوں کے غلیظ ٹکڑے اور چائے کی پتیاں اور ایک پرانی جیکٹ اور بچوں کے گندے پوتڑے اور انڈے کے چھلکے اور اخبار کے ٹکڑے اور رسالوں کے پھٹے اوراق اور روئی کے ٹکڑے اور لوہے کی ٹونیاں اور پلاسٹک کے ٹوٹے ہوئے کھلونے اور مٹر کے چھلکے اور پودینے کے پتے اور کیلے کی چھال پر چند ادھ کھائی پوریاں ..... اور آلو کی بھاجی، پوریوں اور آلو کی بھاجی کو دیکھ کر گویا اس کی آنتیں اُبل پڑیں۔ اُس نے چند لمحوں کے لیے اپنے بے قرار ہاتھ روک لیے مگر دوسری بدبوؤں کے مقابلے میں اس کے نتھنوں میں اگلے چند ثانیوں تک پوری اور بھاجی کی اشتہا آمیز خوشبو اسی طرح تیز تر ہوتی گئی جیسے کسی سمفنی میں یکایک کوئی خاص سُر ایک دم

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اُدھ نچے ہو جاتے ہیں اور یکایک تہذیب کی آخری دیواریں ڈھے گئیں اور اس کے کانپتے ہوئے بے قرار ہاتھوں نے کیلے کے اس پتل کو دبوچ لیا۔ اور وہ اک وحشیانہ گرسنگی سے متاثر ہو کر ان پوریوں پر ٹوٹ پڑا۔ پوری بھاجی کھا کے اس نے کیلے کے پتے کو بار بار چاٹا اور اُسے شفاف کر کے چھوڑ دیا جیسے قدرت نے اسے بنایا تھا۔ پتل چاٹنے کے بعد اس نے اپنی انگلیاں چاٹیں اور لمبے لمبے ناخنوں میں بھری ہوئی آلو کی بھاجی زبان کی نوک سے نکال کے کھائی اور جب اس سے بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کوڑے کے ڈھیر کو ٹٹولتے ہوئے اس میں سے پودینے کے پتے نکال کے کھائے اور مولی کے دو ٹکڑے اور ایک آدھا ٹماٹر اپنے منہ میں ڈال کر مزے سے اس کا رس لیا۔ اور جب وہ سب کچھ کھا چکا تو اس کے سارے جسم میں نیم گرم غنودگی کی اک لہر سی اٹھی اور وہ وہیں ٹب کے کنارے گر کر سو گیا۔

آٹھ دس روز اسی نیم غنودگی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں گزر گئے۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر ٹب کے قریب جاتا اور جو کھانے کو ملتا کھا لیتا۔ اور جب اشتہا آمیز بوؤں کی تسکین ہو جاتی اور دوسری گندی بوئیں اُبھرنے لگتیں، تو وہ گھسٹ گھسٹ کر ٹب سے فٹ پاتھ کے ٹکڑے پر چلا جاتا۔ اور عقبی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا یا سو جاتا۔

پندرہ بیس روز کے بعد ہوتے ہوتے اس کے جسم میں طاقت ابھرنے لگی۔ ہوتے ہوتے وہ اپنے ماحول سے مانوس ہونے لگا۔ یہ جگہ کتنی اچھی تھی۔ یہاں دھوپ نہیں تھی۔ یہاں درختوں کا سایہ تھا، اندھی گلی سنسان اور ویران تھی یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی عقبی عمارت سے کوئی کھڑکی کھلتی تھی اور کوئی ہاتھ پھیلا کر نیچے کے ٹب میں روز مرہ کا کوڑا پھینک دیتا۔ یہ کوڑا جو اس کا روزی رساں تھا۔ اس کے شب و روز کا رازق تھا۔ اس کی زندگی کا محافظ تھا۔ دور، میں سڑک چلتی تھی، دکانیں کھلتی تھیں، لوگ باگ گھومتے تھے، رنگین ابابیلوں کی طرح

چہکتے ہوئے سڑک سے گزر جاتے تھے۔ عورتیں رنگین پتنگوں کی طرح ڈولتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ لیکن یہ ایک دوسری دنیا تھی۔ اس دنیا سے اس کا کوئی علاقہ نہ تھا اس دنیا میں اب اس کا کوئی نہ تھا۔ اور وہ کسی کا نہ تھا۔ اس دنیا سے اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ شہری گلیاں اور بازار اور سڑکیں اس کے لیے مبہم سائے بن گئے۔ اور اس سے باہر کے میدان اور کھیت اور کھلا آسمان ایک بے معنی تصور۔ گھر، کام، کلچر، زندگی، سماج، جدوجہد بے معنی الفاظ جو گل سڑ کر اس کوڑے کچرے کے ڈھیر میں مل کر غتربود ہو گئے تھے۔ اس دنیا سے اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ اور اب یہی اس کی دنیا تھی۔ پندرہ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی!

ماہ و سال گزرتے گئے، اور وہ اس ٹکڑے پر بیٹھا رہا ایک پرانے کھنڈر کی طرح اور کسی پرانی یادگار کی طرح سب کی نظروں میں مانوس ہوتا گیا۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا، کسی کو فیض نہیں پہنچاتا تھا، کسی سے بھیک نہیں مانگتا تھا، لیکن اگر وہ کسی دن وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا تو اس علاقے کے ہر فرد کو اس امر پہ حیرت ہوتی اور شاید کسی قدر تکلیف بھی ہوتی۔

سب لوگ اسے کچرا بابا کہتے تھے، کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ وہ صرف کچرے کے ٹب میں سے اپنی خوراک نکال کر کھاتا ہے اور جس دن اسے وہاں سے کچھ نہ ملتا وہ بھوکا ہی سو جاتا۔ برسوں سے راہگیر اور ایرانی ریسٹوران والے اس کی عادت کو پہچان گئے تھے اور اکثر انہیں جو کچھ ڈالنا ہوتا اس کے لیے وہ اسے کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیتے تھے اور اکثر عمارت کی عقبی کھڑکیوں سے اب کوڑے کچرے کے علاوہ خورد و نوش کی دوسری چیزیں بھی پھینکی جاتیں، صحیح و سالم پوریاں اور بہت سی بھاجی اور گوشت کے ٹکڑے اور ادھ چوسے آم اور بیگن اور کباب کے ٹکڑے اور کھیر میں لتھڑے ہوئے پتل۔ ناؤ نوش کی ہر نعمت کچرا بابا کو اس ٹب میں سے مل جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پھٹا ہوا پاجامہ، کوئی ادھڑی ہوئی نیکر، لیر لیر، تار تار شکستہ قمیض، پلاسٹک کا گلاس، یہ کچرے کا ٹب کیا تھا، اس کے لیے ایک کھلا بازار تھا، جہاں وہ دن

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

دباڑے سب کی آنکھوں کے سامنے مٹر گشت کیا کرتا تھا۔ جس دکان سے جو سودا چاہے مفت لیتا تھا۔ وہ اس بازار کا اس نعمت غیر مترقبہ کا واحد مالک تھا۔ شروع شروع میں چند گرسنہ بلیوں اور خارش زدہ کتوں نے شدید مزاحمت کی تھی، مگر اس نے مار مار کر سب کو باہر نکال دیا تھا۔ اور اب وہ اس کچرے کے ٹب کا واحد مالک تھا اور اُس کے حق کو سب نے تسلیم کر لیا تھا۔ مہینے میں ایک بار میونسپلٹی والے آتے تھے اور اس ٹب کو خالی کر کے چلے جاتے تھے اور کچرا بابا اُن سے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دوسرے دن سے ٹب پھر اسی طرح بھرنا شروع ہو جائے گا۔ اور اس کو اعتقاد تھا کہ اس دنیا سے نیکی ختم ہو سکتی ہے رذالت ختم ہو سکتی ہے، لیکن غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ساری دنیا سے منہ موڑ کر اس نے جینے کا آخری طریقہ سیکھ لیا تھا۔

مگر یہ بات نہیں ہے کہ اُسے باہر کی دنیا کی خبر نہ تھی، جب شہر میں چینی مہنگی ہو جاتی تو مہینوں کچرے کے ٹب میں مٹھائی کے ٹکڑے کی صورت نظر نہیں آتی۔ جب گندم مہنگی ہو جاتی تو ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہ ملتا۔ جب سگریٹ مہنگے ہو جاتے تو سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے اتنے چھوٹے ملتے کہ وہ انہیں سلگا کر پی نہیں سکتا تھا۔ جب بھنگیوں نے ہڑتال کی تھی، تو دو مہینے تک اس کے ٹب کی کسی نے صفائی نہیں کی تھی اور کسی روز اُسے ٹب میں اتنا گوشت نہیں ملتا تھا۔ جتنا بقر عید کے روز اور دیوالی کے دن تو ٹب کے مختلف کونوں سے مٹھائی کے بہت سے ٹکڑے مل جاتے تھے۔ باہر کی دنیا کا کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہ تھا جس کا سراغ وہ کچرے کے ٹب سے دریافت نہ کر سکتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے لے کر عورتوں کے خفیہ امراض تک! مگر باہر کی دنیا سے اب اسے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی! پچیس سال تک وہ اس کچرے کے ٹب کے کنارے بیٹھا بیٹھا اپنی عمر گزارتا رہا۔ شب و روز، ماہ و سال، اس کے سر سے ہوا کی لہروں کی طرح گزرتے گئے۔ اور اس [illegible]

شاخوں کی طرح نکلنے لگے۔ اس کی کالی داڑھی کھچڑی ہو گئی۔ اس کے جسم کا رنگ گھگھامٹ میلا اور سبزی مائل ہوتا گیا۔ اور وہ اپنے مضبوط بالوں، پھٹے چیتھڑوں اور بدبودار جسم سے راہ چلتے لوگوں کو خود بھی کچرے کا ایک ڈھیر دکھائی دیتا تھا جو کبھی کبھی حرکت کرتا تھا اور بولتا تھا۔ کسی دوسرے سے نہیں، صرف اپنے آپ سے یا زیادہ سے زیادہ کچرے کے ٹب سے!

کچرا بابا اُن لوگوں سے کچھ کہتا نہیں تھا، مگر ان کی حیرت کو دیکھ کر دل میں ضرور سوچتا ہو گا کہ اس دنیا میں کون ہے جو کسی دوسرے سے گفتگو کرتا ہے۔ اس دنیا میں جتنی گفتگو ہوتی ہے انسانوں کے درمیان نہیں ہوتی بلکہ صرف اپنی ذات اور اس کی کسی غرض کے درمیان ہوتی ہے، دو دوستوں کے درمیان بھی جو گفتگو ہوتی ہے وہ دراصل ایک طرح کی خود کلامی ہوتی ہے۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا کچرے کا ڈھیر ہے جس میں سے ہر شخص اپنی غرض کا کوئی ٹکڑا، فائدے کا کوئی چھلکا یا منافع کا کوئی چیتھڑا دبوچنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور کہتا ہو گا۔ یہ لوگ جو مجھے حقیر، فقیر یا ذلیل سمجھتے ہیں۔ ذرا اپنی روح کے پچھواڑے میں تو جھانک کر دیکھیں۔ وہاں اتنی غلاظت بھری ہے جسے صرف موت کا فرشتہ ہی اٹھا کر لے جائے گا!

اسی طرح دن پر دن گزرتے گئے، ملک آزاد ہوئے، ملک غلام ہوئے، حکومتیں آئیں، حکومتیں چلی گئیں، مگر یہ کچرے کا ٹب وہیں کا وہیں رہا اور اس کے کنارے بیٹھنے والا کچرا بابا اسی طرح نیم غنودگی نیم بے ہوشی کے عالم میں دنیا سے منہ موڑے ہوئے زیر لب کچھ بڑبڑاتا رہا اور کچرے کے ٹب کو گھنگھولتا رہا۔

تب ایک رات اندھی گلی میں جب وہ ٹب سے چند فٹ کے فاصلے پر دیوار سے پیٹھ لگائے اپنے پھٹے چیتھڑوں میں دُبکا ہوا سو رہا تھا۔ اس نے رات کے سناٹے میں ایک خوفناک چیخ سنی اور وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا، پھر اس

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نے ایک زور کی تیز چیخ سنی اور وہ گھبرا کر کچرے کے ٹب کی طرف بھاگا، جدھر سے یہ چیخیں سنائی دے رہی تھیں ۔

کچرے کے ٹب کے پاس جاکر اس نے ٹٹولا، تو اس کا ہاتھ کسی نرم نرم لوتھڑے سے جا ٹکرایا اور پھر ایک زور کی چیخ بلند ہوئی ۔ کچرا بابا نے دیکھا کہ ٹب کے اندر ڈبل روٹی کے ٹکڑوں، نچوڑی ہوئی ہڈیوں، پرانے جوتوں، کانچ کے ٹکڑوں، آم کے چھلکوں، باسی دینیوں اور کچرے کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے درمیان ایک نوزائیدہ بچہ ننگا پڑا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر زور زور سے چیخ رہا ہے ۔

چند لمحوں تک کچرا بابا حیرت میں ڈوبا ہوا جامد و ساکت اس ننھے انسان کو دیکھتا رہا جو اپنے چھوٹے سے سینے کی پوری قوت سے اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا چند لمحوں تک وہ چپ چاپ، پریشان، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھتا رہا پھر اس نے تیزی سے آگے جھک کر کچرے کے ٹب سے اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اور جلدی سے اسے اپنے پھٹے چیتھڑوں میں چھپا لیا ۔

مگر بچہ اس کی گود میں سما کر بھی کسی طرح چپ نہ رہا ۔ وہ اس زندگی میں نیا نیا آیا تھا ۔ اور بلک بلک کر اپنی بھوک کا اعلان کر رہا تھا ۔ ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ غریبی کیا ہوتی ہے، ممتا کس طرح تبدیل ہو جاتی ہے، زندگی کیسے حرامی بن جاتی ہے ۔ وہ کس طرح میلے پیٹ اور غلیظ بنا کر کچرے کے ٹب میں ڈال دی جاتی ہے ابھی اسے یہ سب کچھ معلوم نہ تھا ۔ ابھی وہ صرف بھوکا تھا اور رو رو کر اپنے پیٹ پہ ہاتھ مار رہا تھا اور ٹانگیں چلا رہا تھا ۔

کچرا بابا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیسے اس بچے کو چپ کرائے ۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا ۔ نہ دودھ نہ گھٹی، اسے تو کوئی لوری بھی یاد نہ تھی ۔ وہ بے قرار ہو کر بچے کو گود میں لے کر تھپتھپانے لگا اور گہری ناامیدی سے رات کے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا ۔ کہ اسے اس وقت بچے کے لیے دودھ کہاں سے مل سکتا ہے، لیکن جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے جلدی سے کچرے کے ٹب سے آم کی

ایک گٹھلی نکال لی اور اس کا سرا بچے کے منہ میں دے دیا ۔

آدھ کھائے ہوئے آم کا میٹھا میٹھا رس جب بچے کے منہ میں جانے لگا تو وہ روتا روتا چپ ہو گیا اور چپ ہوتے ہوتے کچرا بابا کی بانہوں میں سو گیا ۔ آم کی گٹھلی کھسک کر زمین پر جا گری اور اب بچہ اس کی بانہوں میں بے خبر سو رہا تھا ۔ آم کا پیلا پیلا رس ابھی تک اس کے نازک لبوں پر تھا اور اس کے ننھے سے ہاتھ نے کچرا بابا کا انگوٹھا بڑے زور سے پکڑ رکھا تھا ۔

ایک لمحے کے لیے کچرا بابا کے دل میں خیال آیا کہ وہ بچے کو یہیں پھینک کر کہیں بھاگ جائے ۔ دھیرے سے کچرا بابا نے اس بچے کے ہاتھ سے اپنے انگوٹھے کو چھڑانے کی کوشش کی ۔ مگر بچے کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور کچرا بابا کو ایسے محسوس ہوا جیسے زندگی نے اسے پھر سے پکڑ لیا ہے ۔ اور دھیرے دھیرے جھٹکوں سے اسے اپنے پاس بلا رہی ہے ۔ یکایک اسے ڈلاری کی یاد آئی ۔ اور وہ بچہ جو اس کی کوکھ میں کہیں ضائع ہو گیا تھا ۔ اور یکایک کچرا بابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ آج سمندر کے پانیوں میں اتنے قطرے نہ تھے جتنے آنسو اس کی آنکھوں میں تھے ۔ گزشتہ پچیس برسوں میں جتنی میل اور غلاظت اس کی روح پہ جم چکی ہے وہ اس طوفان کے ایک ہی ریلے میں صاف ہو گئی ۔

رات بھر کچرا بابا اس نوزائیدہ بچے کو اپنی گود میں لیے بے چین اور بے قرار ہو کر فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا اور جب صبح ہوئی اور سورج نکلا تو لوگوں نے دیکھا کہ کچرا بابا آج کچرے کے ٹب کے پاس نہیں ہے ۔ بلکہ سڑک کے پار نئی تعمیر ہونے والی عمارت کے نیچے کھڑا ہو کر اینٹیں ڈھو رہا ہے اور اس عمارت کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں ایک پھولدار کپڑے میں لپٹا ہوا ایک ننھا بچہ منہ میں دودھ کی چسنی لیے مسکرا رہا ہے ۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ایرانی پلاؤ

آج رات اپنی تھی، کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے۔ جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو رات مجھے اپنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس وقت رات میرین ڈرائیو پر تفریح کرنے والی گاڑیوں کی معلوم ہوتی ہے۔ جگمگاتے ہوئے فلیٹوں کی معلوم ہوتی ہے، ایمبیسڈر ہوٹل کی چھت پر ناچنے والوں کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آج رات بالکل اپنی تھی۔ آج رات آسمان کے سارے ستارے اپنے تھے اور بمبئی کی ساری سڑکیں اپنی تھیں۔ جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو سارا شہر اپنے اوپر مسلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہر شے گھورتی ہے، ڈانٹتی ہے۔ اپنے آپ سے دور رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اونی پتلون سے لے کر خوش نما ریڈیو پروگرام تک ہر چیز کہتی ہے مجھ سے دور رہو۔ لیکن جب جیب میں ایک پائی نہ ہو اس وقت سارا شہر اپنے لیے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہر پتھر پر، گلی کے موڑ پر، بجلی کے ہر کھمبے پر گویا یہ لکھا ہوتا ہے "تعمیر کیا برائے لطف ایک فاقہ مست مصنف۔" اس دن نہ حوالات کا ڈر ہوتا ہے نہ گاڑی کی لپیٹ میں آ جانے کا، نہ ہوٹل میں کھانے کا۔ ایک ایسی وسیع بے فکری اور بے کنار فاقہ مستی کا نشہ آور موڈ ہوتا ہے جو میلوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس رات میں خود نہیں چلتا ہوں، اس رات بمبئی کی سڑکیں مجھے اٹھائے اٹھائے چلتی ہیں۔ اور گلیوں کے موڑ پر اور بازاروں کے نکڑ اور بڑی بڑی عمارتوں کے نا کہ کونے مجھے خود دعوت دیتے ہیں "ادھر آؤ ہمیں بھی دیکھو ہم سے ملو۔ دوست تم آٹھ سال سے اس شہر میں رہتے ہو۔ لیکن پھر بھی اجنبیوں کی طرح کیوں چل رہے ہو۔

ادھر آؤ ہم سے ہاتھ ملاؤ۔"

آج رات اپنی تھی، آج رات کسی کا ڈر نہیں تھا۔ ڈر اسے ہوتا ہے جس کی جیب بھاری ہوتی ہے۔ اس خالی جیبوں والے ملک میں بھاری جیب والوں کو ڈر ہونا ہی چاہیے۔ لیکن اپنے پاس کیا تھا جسے کوئی چھین سکتا۔

سنا ہے کہ حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے جس کی رو سے رات کے بارہ بجے کے بعد سڑکوں پر گھومنا منع ہے۔ کیوں کیا بات ہے، رات کے بارہ بجے کے بعد بمبئی میں کیا ہوتا ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ میں تو ضرور دیکھوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، آج رات تو مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے، نہ کسی وزیر کا۔ نہ کسی حوالات کا۔ کچھ بھی ہو جائے۔ آج تو میں ضرور گھوموں گا اور اپنے دوستوں سے ہاتھ ملاؤں گا۔

یہی سوچ کر میں چرچ گیٹ ریکلے میشن کے سامنے کی سڑک سے گزر کر یونیورسٹی گراؤنڈ میں گھس گیا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ میدان کے بیچ میں سے گزر کر دوسری طرف بڑے تار گھر کے سامنے جا نکلوں گا۔ اور وہاں سے فلورا فاؤنٹین چلا جاؤں گا۔ مگر میدان سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں چند لڑکے دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور تالی بجا بجا کر گا رہے ہیں:

تیرا میرا پیار ہو گیا
تیرا میرا
میرا تیرا
تیرا، میرا، پیار ہو گیا

دو تین لڑکے تالی بجا رہے تھے، ایک لڑکا منہ سے بانسری کی آواز نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکا سر ہلاتے ہوئے ایک لکڑی کے بکس سے طبلے کے بول نکال رہا تھا۔ سب خوشی سے جھوم رہے تھے اور موٹی پتلی اونچی نیچی آوازوں میں گا رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر پوچھا:

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"کیوں بھئی کس کا کس سے پیار ہوگیا؟"

وہ لوگ گانا بند کر کے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھنے میں مصروف ہو گئے پتہ نہیں لوگوں کو دیکھنے میں کیسا لگتا ہوں میں۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ ایک لمحے کے لیے دیکھنے کے بعد لوگ بہت جلد مجھ سے گھل مل جاتے ہیں۔ مجھ سے ایسے مانوس ہو جاتے ہیں کہ زندگی بھر کے راز اور اپنی مختصر سی کائنات کی ساری تصویریں اور اپنے دل کے سارے دکھ درد مجھ سے کہنے لگ جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر کوئی بڑائی نہیں، کوئی خاص اچنبھے کی بات نہیں۔ کوئی رعب اور دبدبہ نہیں، میرے لباس میں بھی کوئی خاص شوکت نہیں۔ وہ طنطنہ نہیں جو کالی اچکن اور سرخ گلاب کے پھول میں ہوتا ہے۔ شارک اسکن کے سوٹ میں ہوتا ہے۔ بس پاؤں میں معمولی چپل ہے، اس کے اوپر لٹھے کا پاجامہ اس کے اوپر لٹھے کی قمیض ہے جو اکثر پیٹھ پر سے میلی رہتی ہے کیونکہ ایک تو مجھے اپنے جھونپڑے میں زمین پر سونے کی عادت ہے۔ دوسرے مجھ میں یہ بھی بری عادت ہے کہ جہاں پر بیٹھتا ہوں اکثر دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی میں میلی دیواریں زیادہ آتی ہیں، اور اجلی دیواریں بہت کم۔ قمیض کم بخت کندھوں سے بہت جلد جاتی ہے اور وہاں اکثر آپ کو ٹانکے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ ٹانکے پھٹے پرانے کپڑے کو جوڑنے کی بار بار کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کالی اچکن پر سرخ گلاب کا پھول نہیں ٹانک سکتا۔ اس ٹانکے اور اس ٹانکے میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ یہ سچ ہے کہ دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے ایک شکل و صورت کے نہیں ہوتے ہیں۔ بمبئی میں شب و روز مختلف چہرے دیکھتا ہوں لاکھوں مختلف چہرے لیکن یہ کیا بات ہے کہ ان سب کے کندھوں پر وہی ٹانکے لگے ہوتے ہیں۔ لاکھوں ٹانکے پھٹی ہوئی زندگیوں کے کناروں کو ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ایک نقاد نے میرے افسانے پڑھ کر کہا تھا کہ مجھے ان میں کسی انسان کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ یہی مجھ میں مصیبت ہے کہ میں اپنے کرداروں کے چہرے نہیں بیان کرتا۔ ان کے

www.angoothachaap.blogspot.com

کندھے کے ٹانکے دیکھتا ہوں۔ ٹانکے مجھے انسان کا اندرونی چہرہ دکھاتے ہیں اس کی دن رات کی کشمکش اور اس کی شب و روز کی محنت کا سراغ بتاتے ہیں۔ جس کے بغیر زندگی کا کوئی ناول اور سماج کا کوئی افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میرا چہرہ دیکھ کر کوئی مجھے کلرک سمجھتا ہے۔ کوئی کمباٹیا کوئی کنگھی بیچنے والا یا بال کاٹنے والا۔ آج تک کسی نے مجھے وزیر یا جیب کاٹنے والا نہیں سمجھا۔ اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میں ان لاکھوں کروڑوں چھوٹے آدمیوں میں سے ایک ہوں جو بہت جلد ایک دوسرے سے بغیر کسی رسمی تعارف کے مانوس ہو جاتے ہیں۔

یہاں بھی ایک امتحانی لمحے کی جھجک کے بعد وہ لوگ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ایک لڑکے نے مجھ سے کہا: "آؤ بھائی تم بھی یہاں بیٹھ جاؤ اور اگر گانا چاہتے ہو تو گاؤ۔"

اتنا کہہ کر اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنے سر کے بال جھٹک کر پیچھے کر لیے اور اپنا لکڑی کے بکس کا طبلہ بجانے لگا۔ ہم سب لوگ مل کر پھر گانے لگے:

تیرا میرا

میرا تیرا

پیار ہوگیا

یکایک اس دبلے پتلے لڑکے نے طبلہ بجانا بند کر دیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو اپنی گردن دونوں ٹانگوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا، ٹھوکا دے کر کہا "ابے مدھوبالا تو کیوں نہیں گاتا؟"

مدھوبالا نے اپنا چہرہ ٹانگوں میں سے بڑی دقت سے نکالا۔ اس کا چہرہ مدھوبالا ایکٹرس کی طرح حسین نہیں تھا۔ ٹھوڑی سے لے کر دائیں ہاتھ کی کہنی تک آگ سے جلنے کا ایک بہت بڑا نشان یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو اس کے گول چہرے پر

www.ma-elibrary.blogspot.com

دو کالی درزوں میں معلوم ہوتی تھیں انتہائی پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کے طبلے والے سے کہا: "سالے مجھے رہنے دے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

"کیوں درد ہوتا ہے! سالے تو نے آج بھی ایرانی پلاؤ کھایا ہو گا؟"

مدھو بالا نے بڑے دکھ سے سر ہلایا۔ "ہاں وہی کھایا تھا۔"

کیوں کھایا تھا سالے

کیا کرتا، آج صرف تین جوتے بنانے تھے۔

ایک اور لڑکے نے جو عمر میں ان سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ جس کی ٹھوڑی پر تھوڑی تھوڑی ڈاڑھی اُگی تھی اور کنپٹیوں کے بال رخساروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا "ابے مدھو بالا۔ اٹھ میدان میں دوڑ لگا۔ چل میں تیرے ساتھ دوڑتا ہوں۔ دو چکر لگانے سے پیٹ کا درد ٹھیک ہو جاتے گا۔"

"نہیں بے رہنے دے۔"

"نہیں بے سالے اُٹھ، نہیں تو ایک چانٹا جڑ دوں گا۔"

مدھو بالا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مجھکو رہنے دے۔ میں تیری منت کرتا ہوں۔ پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اُٹھ بے۔ کیوں ہماری سنگت خراب کرتا ہے۔"

گگو نے ہاتھ بڑھا کر مدھو بالا کو اٹھایا اور وہ دونوں یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں چکر لگانے لگے۔ پہلے تو میں تھوڑی دیر تک ان دوڑتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جب میرے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے نے سر کھجا کے کہا: "سالی کیا مصیبت ہے ایرانی پلاؤ۔ کھاؤ تو مصیبت اور نہ کھاؤ تو مصیبت۔"

میں نے کہا "بھائی پلاؤ تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ اسے کھانے سے پیٹ میں درد کیسے ہو سکتا ہے؟" میری بات سن کر وہ سب ہنسے۔ ایک لڑکے نے جس کا نام بعد میں مجھے کلدیپ کور معلوم ہوا اور جو اس وقت ایک پھٹی ہوئی بنڈی اور ایک پھٹی ہوئی نیکر

پہنے تھا، مجھ سے ہنس کر کہا "معلوم ہوتا ہے تم نے ایرانی پلاؤ کبھی نہیں کھایا؟"

کلدیپ کور نے اپنی بنڈی کے بٹن کھولتے ہوئے مجھے بتایا کہ ایرانی پلاؤ ان لوگوں کی خاص اصطلاح ہے۔ اسے یہ لوگ روز روز نہیں کھاتے لیکن جس دن ان لڑکے نے جوتے بہت کم پالش کیے ہوتے ہیں یا جس دن اس کے پاس بہت کم پیسے ہوتے ہیں اُس دن اسے ایرانی پلاؤ ہی کھانا پڑتا ہے اور یہ پلاؤ سامنے کے ایرانی ریستوران سے رات کے بارہ بجے کے بعد ملتا ہے جب سب گاہک کھانا کھا کے چلے جاتے ہیں۔ دن بھر میں جو لوگ ڈبل روٹی کے ٹکڑے اپنی پلیٹوں میں چھوڑ جاتے ہیں ڈبل روٹی کے ٹکڑے، گوشت اور ہڈیاں چچوڑی ہوئی، چاول کے دانے، آملیٹ کے ریزے، آلوؤں کے قتلے، یہ سارا جھوٹا کھانا ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے اور اس کا ایک ملغوبہ تیار کر لیا جاتا ہے اور یہ ملغوبہ دو آنے پلیٹ کے حساب سے بکتا ہے۔ پیچھے کچن کے دروازے پہ اسے ایرانی پلاؤ کہا جاتا ہے۔ اسے عام طور پر اس علاقے کے غریب لوگ بھی نہیں کھاتے پھر بھی ہر روز دو تین سو پلیٹیں بک ہی جاتی ہیں۔ خریداروں میں یا تو جوتے پالش کرنے والے، فرنیچر ڈھونے والے، گاہکوں کے لیے ٹیکسی لانے والے ہوتے ہیں یا آس پاس کی بلڈنگوں کے بیکار نوکر یا زیر تعمیر بلڈنگوں میں کام کرنے والے مزدور بھی ہوتے ہیں۔

میں نے کلدیپ کور سے پوچھا "تمہارا نام کلدیپ کور کیوں ہے؟" کلدیپ کور نے اپنی بنڈی بالکل اتار دی اور اب وہ بڑے مزے سے بیٹھا ہوا اپنا سیاہ پیٹ سہلا رہا تھا۔ وہ میرا سوال سن کر وہیں گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ پھر ہنسی تھمنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا۔

"ذرا میرا بکسا لانا۔"

ساتھی نے کلدیپ کور کا بکسا لا کر دیا۔ کلدیپ کور نے بکسا کھولا۔ اس میں پالش کا سامان تھا۔ پالش کی ڈبیوں پہ کلدیپ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا: "تو بھی اپنا بکسا کھول۔" اس نے بھی اپنا بکس کھولا۔ اس بکس میں پالش

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کی جتنی چھوٹی بڑی ڈبیاں تھیں ان پر نرگس کی تصویریں تھیں، جو رسالوں اور اخباروں کے صفحوں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔

کلدیپ کور نے کہا "یہ سالا نرگس پالش مارتا ہے۔ وہ نمی کا وہ ثریا کا۔ ہم میں سے جتنا پالش والا ہے، کسی نہ کسی فلم ایکٹریس کی تصویر کاٹ کر اپنے ڈبوں پر لگاتا ہے اور اس کا پالش مارتا ہے۔"

"کیوں؟"

"سالا گاہک ان باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ ام اس سے بولتا ہے صاحب کون سا پالش لگاؤں۔ نرگس کہ ثریا کہ مدھوبالا؟ پھر جو گاہک جس فلم ایکٹریس کو پسند کرتا ہے۔ اس کا پالش مانگتا ہے تو ہم اس کو اس لڑکے کے حوالے کر دیتا ہے جو نرگس کا پالش یا نمی کا یا کسی دوسری فلم ایکٹریس کا پالش مارتا ہے۔ ہم آٹھ لڑکے ہیں، ادھر سامنے چرچ گیٹ پر بس سٹینڈ کے پیچھے بیٹھتے ہیں۔ جس کے پاس جس ایکٹریس کا پالش ہے وہی اس کا نام ہے۔ اسی سے ہمارا دھندا بہت اچھا چلتا ہے اور کام کرنے میں بھی مزا آتا ہے۔"

میں نے کہا "تم ادھر بس اسٹینڈ کے پیچھے فٹ پاتھ پر ایرانی ریستوران کے سامنے بیٹھتے ہو تو پولیس والا کچھ نہیں کہتا؟"

کلدیپ کور اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اب سیدھا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو ایک انگلی سے دبا کے اسے یکایک ایک جھٹکے سے یوں نچایا جیسے وہ فضا میں اکنی اچھال رہا ہو۔ بولا "وہ سالا کیا کہے گا؟ اسے پیسہ دیتا ہے اور یہاں اس میدان میں جو سوتا ہے اس کا بھی پیسہ دیتا ہے۔ بیسہ؟" اتنا کہہ کے کلدیپ کور نے پھر انگوٹھے سے ایک خیالی اکنی ہوا میں اچھالی اور فضا میں دیکھنے لگا۔ اور پھر دونوں ہاتھ کھول کر دیکھا۔ مگر دونوں خالی تھے کلدیپ کور بڑی مزے وار تمانیت سے مسکرایا۔ اس نے کچھ نہیں کہا چپ چاپ اوندھا لیٹ گیا۔

نرگس نے مجھ سے پوچھا۔ تم ادھر دادر میں پالش مارتے ہو نا؟ میں نے تم کو

یزداں ہوٹل کے سامنے شاید دیکھا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں مجھ کو بھی ایک طرح کا پالش والا ہی سمجھو۔"

"ایک طرح سے کیا؟" کلدیپ کور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا "سالا سیدھے سیدھے بات کرو نا۔ تم کیا کام کرتا ہے؟"

اس نے سالا کہا۔ میں بہت خوش ہوا۔ کوئی اور کہتا تو میں اسے ایک جڑ دیتا۔ مگر جب اس لڑکے نے مجھے سالا کہا تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ یہاں سالا گالی کا لفظ نہیں تھا۔ برادری کا لفظ تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی برادری میں شامل کر لیا تھا۔ اسی لیے میں نے کہا "بھائی ایک طرح سے میں بھی پالش والا ہوں۔ مگر میں لفظ پالش کرتا ہوں اور کبھی کبھی پرانے میلے چیتھڑوں کو کھرچ کے دیکھتا ہوں کہ ان کی بوسیدہ تہوں میں کیا ہے۔"

نرگس اور نمی ایک دم بول اٹھے "تو سالا پھر گڑبڑ گھوٹالا کرتا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں بولتا۔ کیا کام کرتا ہے؟"

میں نے کہا۔ میرا نام کرشن ہے۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اخباروں میں لکھتا ہوں۔

"اوہ تو بابو ہے۔" نمی بولا۔ نمی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ یہاں دائرے میں جتنے لڑکے تھے ان سب سے چھوٹا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی اور چونکہ وہ اخبار بھی بیچتا تھا۔ اس لیے اسے مجھ میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا "کون سے اخباروں میں لکھتے ہو؟ فری پریس۔ سنٹل ٹائمز۔ بمبئی کرانیکل۔ میں سب اخباروں کو جانتا ہوں۔"

وہ بڑھ کے میرے قریب آ گیا۔

میں نے کہا "میں شاہراہ میں لکھتا ہوں۔"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"سا برہ؟ کون لونڈ پیپر ہے؟"

"دلی سے نکلتا ہے"۔

"دلی کے چھاپے خانے سے۔ اوہ؟" نمی کی آنکھیں میرے چہرے پر پھیل گئیں۔

"اور ادبِ لطیف میں لکھتا ہوں" میں نے رعب ڈالنے کے لیے کہا۔

کلدیپ کور ہنسنے لگا "کیا کہا۔ بدبے خلطیف میں لکھتا ہے۔ سالے یہ تو کسی انگلش نیم ایکٹریس کا نام معلوم ہوتا ہے۔ بدبے خلطیف، آہاہاہا۔ ابے نمی تو اپنا نام بدل کے بدبے خلطیف رکھ لے۔ بڑا اچھا نا مالوم ہوگا۔ ہاہاہاہا۔" جب سب لڑکے ہنس چکے تو میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "بدبے خلطیف نہیں۔ ادب، ادبِ لطیف، لاہور سے نکلتا ہے۔ بہت اچھا پیپر ہے۔"

نرگس نے بے پروا ہی سے سر ہلا کے کہا "ہاں سالے ہوگا ادبِ لطیف ہی ہوگا ہم کو کیا۔ ہم اس کو بیچ کے ادھر پیسہ تھوڑی کماتے ہیں۔

بس تقریباً اتنا ہی جتنا تمہیں ملتا ہے۔ اکثر کچھ بھی نہیں ملتا جب میں لفظوں پر پالش کر چکتا ہوں تو اخبار والے شکریہ کہہ کر مفت لے جاتے ہیں اور اپنے رسالے یا اخبار کو چمکا لیتے ہیں۔"

تو خالی مغز ماری کیوں کرتا ہے۔ ہماری طرح پالش کیوں نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں تو بھی آجا ہماری برادری میں۔ بس تیری ہی کسر تھی۔ اور تیرا نام ہم بدبے خلطیف ہی رکھ دیں گے۔ لا ہاتھ" میں نے کلدیپ کور سے ہاتھ ملایا۔

کلدیپ کور کہنے لگا۔ "مگر چار آنے روز پولیس والے کو دینے پڑیں گے۔"

"اور اگر کسی روز چار آنے نہ ہوئے تو؟"

www.angoothachaap.blogspot.com

"تو ہم کو مالوم نہیں۔ کسی سے مانگ۔ چوری کر۔ ڈاکہ ڈال۔ مگر سنتری کو چار آنے دینے پڑیں گے اور مہینے میں دو دن حوالات میں رہنا پڑے گا۔"

"ارے وہ کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔ سنتری کو ہم ہر روز چار آنے دیتے ہیں ہر ایک پالش والا دیتا ہے۔ پھر بھی سنتری ہر مہینے میں دو دفعہ ہم کو پکڑ کے لے جاتا ہے۔ ایسا اس کا قاعدہ ہے۔ وہ بولتا ہے۔ ام کیا کریں۔"

میں نے کہا: "اچھا دو دن حوالات میں بھی رہ لیں گے۔"

اور کلدیپ کور نے کہا: "تم کو مہینے میں ایک بار کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ تمہارا چالان ہوگا۔ کمیٹی کے آدمی کی طرف سے۔ تم کو کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ دو روپے یا تین روپے وہ بھی تم کو دینا پڑے گا۔"

"وہ کیوں! جب میں چار آنے سنتری کو دیتا ہوں۔ پھر ایسا کیوں ہوگا؟"

ارے یار سنتری کو بھی تو اپنی کارگزاری دکھانی ہے کہ نہیں۔ تو سمجھتا نہیں ہے۔ سالے بدبے خلطیف؟

میں نے آنکھ مار کر کلدیپ کور سے کہا۔ سالے سب سمجھتا ہوں۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں مدھو بالا اور لنگو دونوں میدان کے چکر لگا کر پسینے میں ڈوبے ہوئے واپس آگئے۔

میں نے مدھو بالا سے پوچھا: "تمہارا پیٹ کا درد غائب ہوگیا؟"

مدھو بالا: "درد تو غائب ہوگیا۔ مگر اب بھوک بڑے زور سے لگی ہے۔"

نرگس نے کہا: "اور مجھے بھی۔"

تو کیا پھر ایرانی پلاؤ آئے گا؟ پھر پیٹ میں درد ہوگا۔ پھر میدان

www.ma-elibrary.blogspot.com

کے چکر اور پھر بھوک ؟" کلدیپ کور نے بڑی تلخی سے کہا ۔

نمی نے کہا: "میں دو پیسے دے سکتا ہوں ۔"

میں نے کہا" ایک آنہ میری طرف سے ۔"

سب مل کر چار آنے ہوئے ۔ نمی کو ایرانی پلاؤ لانے بھیجا گیا کہ سب سے چھوٹا وہی تھا ۔ پھر ایرانی ریستوران کا باورچی اسے پسند بھی کرتا تھا ۔ ممکن ہے نمی کو دیکھ کر چار آنے میں دو پلیٹوں کی بجائے تین پلیٹیں یا کم از کم تین پلیٹوں کا مال مل جائے ۔"

جب نمی چلا گیا تو میں نے پوچھا ۔"کیا تم لوگ ہر روز یہیں سوتے ہو؟"

"مدھو بالا کے سوا اور سب یہیں سوتے ہیں" ٹینگو نے کہا "مدھو بالا اپنے گھر جاتا ہے ۔ مگر آج نہیں گیا ۔"

میں نے مدھو بالا سے پوچھا" تمہارا گھر ہے ؟"

"ہاں ۔ سائن میں ایک جھونپڑا ہے ۔ ماں وہاں رہتی ہے ۔"

"اور باپ ؟"

مدھو بالا نے کہا: "باپ ؟ باپ کا مجھے کیا پتہ ؟ ہوگا سالا سامنے والی کسی بلڈنگ کا سیٹھ ۔"

یکا یک وہ سب چپ ہو گئے ۔ جیسے کسی نے ان کے چہرے پر چپت ماردی ہو ۔ لڑکے جو بے آسرا تھے ، بے گھر تھے ، بے نام تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ آنے والی محبت کو فلمی گانوں سے بھرنے کی کوشش کی تھی ۔

"تیرا میرا پیار ہو گیا ۔ کدھر ہے تیرا پیار ؟ اے میرے باپ اے میری ماں ۔ اے میرے بھائی تو کون ہے ؟"

تو کون تھا ؟ کس لیے تو مجھے اس دنیا میں لے آیا اور ان سخت بے رحم

عمارتوں کے تنتیس ، دہ فٹ پاتھوں پر دھکے کھانے کے لیے چھوڑ دیا گیا ایک لمحے کے لیے ان لڑکوں کے فق فریادی چہرے کسی نامعلوم ڈر سے خوفزدہ ہو گئے اور بڑی سختی سے انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے ، جیسے کہیں سے انہیں آسرا نہ ملا ۔ جیسے اس شہر کی ہر بڑی عمارت ہر فٹ پاتھ اور ہر چلنے والے قدم نے انہیں ٹھکرا دیا ۔ اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں مجھے وہ اس ایسے ہی خوفزدہ اور معصوم معلوم ہو رہے تھے ۔ جیسے بھولے بھالے بچے کسی نامعلوم بے کنار جنگل میں کھو جائیں ۔ اسی لیے کبھی کبھی مجھے ایک شہر نہیں معلوم ہوتا ہے ۔ جس میں معاشرے کی بے نام اولاد سڑکوں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ٹٹولتی معلوم ہوتی ہے اور جب راستہ نہیں ملتا تو آنکھیں بند کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہے ، پھر میں سوچتا ہوں ایسا نہیں ہے ۔

بمبئی ایک جنگل نہیں ہے ۔ شہر ہے ۔ لوگ کہتے ہیں ۔ اس کی ایک میونسپل کارپوریشن ہے ۔ اس کی ایک حکومت ہے ایک نظام ہے اس کی گلیاں ہیں ، بازار ہیں ، دکانیں ہیں ۔ راستے ہیں اور گھر ہیں اور یہ سب ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوتے ہیں جیسے ایک مہذب اور متمدن شہر میں چیزیں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں ۔ یہ سب میں جانتا ہوں ۔ اس کے رستے اور گھروں کو پہچانتا ہوں ۔ ان کی عزت اور احترام کرتا ہوں ، لیکن اس عزت اور احترام ، اس محبت کے باوجود میں کیوں دیکھتا ہوں کہ اس بمبئی شہر میں کتنی ہی گلیاں ایسی ہیں جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے ۔ کتنے ہی راستے ایسے ہیں جو کسی منزل کو نہیں جاتے ، کتنے ہی بچے ایسے ہیں جن کے لیے کوئی گھر نہیں ہے ۔ یکا یک اس خاموشی کو نمی نے توڑ دیا ۔ وہ بھاگتا ہوا ہمارے سامنے آ گیا ۔ اس کے ہاتھ میں ایرانی پلاؤ کی تین پلیٹیں تھیں ۔ ان سے گرم گرم سوندھا سوندھا دھواں اٹھ رہا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

تھا۔ جب اس نے پلیٹیں لاکر گھاس پر رکھ دیں۔ تو ہم نے دیکھا کہ نمّی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"کیا ہوا ہے؟"

کلدیپ کور نے پوچھا۔

نمّی نے غضب ناک لہجے میں کہا:

"باورچی نے بڑے زور سے یہاں کاٹ کھایا ہے۔"

نمی نے اپنا بایاں رُخسار ہماری طرف کر دیا۔

ہم نے دیکھا بائیں رخسار پر بہت بڑا نشان تھا۔

کلدیپ کور نے باورچی کو گالی دیتے ہوئے کہا

"حرام زادہ ــــ"

مگر اس کے بعد وہ سب لوگ ایرانی پلاؤ پر ٹوٹ پڑے۔

گرجن کی ایک شام

عرشی اور ارضی کی بحث بہت پرانی ہے۔ وہ ادیب جو ہر وقت آسمان پہ نظر رکھتے ہیں، ان کی خدمت میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے

میکسم گورکی

مدتوں سے تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ شاید دنیا کی فریب کاریوں کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر جگدیش کی دلدوز محبت کا آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ ٹھیک طرح سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم پوچھو: کیا جگدیش بھی محبت کر سکتا ہے؟ موٹا سا آدمی، گو کچھ اتنا موٹا بھی نہیں۔ لبوں پہ ہر وقت مسکراہٹ، شکار کا شوقین، بیرج اور وہسکی کا پجاری۔ کیا ایسا شخص بھی الفت کی ستم ہائے کاریوں کی تاب لا سکتا ہے؟ تو میری جان، میرے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ ...... مگر نہیں یہ بہتر ہو گا کہ پہلے میں تمہیں اس جگہ کے متعلق بتاؤں جہاں ہم گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ ماحول نہ صرف حیاتِ معاشقہ کا بلکہ ہماری تمام زندگی کا جزوِ اعظم ہے اور خاص کر محبت اور ماحول میں جو گہرا تعلق ہے وہ مجنوں کی بادیہ پیمائی اور فرہاد کی کوہ کنی سے صاف عیاں ہے۔ دور کیوں جاؤ! تمہارے وطن پنجاب ہی میں سوہنی مہینوال کا افسانۂ محبت دریائے چناب کی پُرشور وادیوں کا رہینِ منت ہے، اور ہیر رانجھے کا دلفریب قصۂ الفت ذات پات

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اور رقیب نئی نئی کہاوتوں کی دیوار پر عشق ۔ پیچاں کی طرح آویزاں نظر آتا ہے اور سچ پوچھو تو غالباً ہم کسی فردِ واحد سے محبت نہیں کرتے بلکہ محبت کرتے ہیں تو صرف اپنے آپ سے ۔ دراصل انسانی محبت بذاتِ ایک حقیر سی شے ہے ۔ محبت ہے کیا؟ یہی دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا سنگم ۔ لیکن جو چیز اسے عرفانی بلندیوں پہ لے جاتی ہے یا ابدی پستیوں میں گرا دیتی ہے وہ اس کا ماحول ہی ہے ۔ بچارا جگدیش بھی ایسا ہی کرتا تھا ۔ لیکن آج اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے پوچھو جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جن کی گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی سسکتے ہوئے آہو کے درد کا آئینہ دار ہے ۔

سب سے پہلی بات جو میں تمہیں اس جگہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں وہ اس کی بلندی ہے ۔ یہ جگہ سطحِ سمندر سے سترہ ہزار فٹ بلند ہے ۔ اس رفعت پر پہنچ کر انسانی محبت بھی بلند ہو جاتی ہے ۔ خیالات و تاثرات میں غیر ارادی و غیر شعوری طور پر ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے ۔ دماغ پر ایک عجیب سا دبدبہ طاری ہو جاتا ہے ۔ تنفس کا دورہ تیز ہو جاتا ہے اور کاندھوں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منوں بوجھ تھا جو اٹھ گیا ۔ اوپر دیکھو تو اڑنے کو جی چاہتا ہے اور نیچے دیکھو تو میلوں تک سلسلہ ہائے کوہ گرتے ابھرتے اور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ چشم زدن میں نظر ان پہاڑوں اور وادیوں سے پھسلتی ہوئی نچلے میدانوں پر پڑتی ہے اور نظر کا آخری نقطہ وہ ہے جہاں دریائے جہلم کا پانی چاندی کے پتلے تار کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے اس بلندی پر پہنچ کر آدمی سب پستیوں کو بھول جاتا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پاک و صاف سمجھتا ہے جتنی کہ یہ سپید برف، جس کی آب و تاب میں موت کی خاموشی اور قدرت کی پاکیزگی پنہاں ہے ۔ یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ اوشا کی محبت کتنی حقیر تھی اور اس کا دائرہ کتنا محدود ۔ یہ وہ محبت تھی جو صرف ڈرائنگ روم ہی میں کی جا سکتی ہے ۔ اُس استوائی پھول کی طرح جو شیشوں کی دیواروں کے اندر ایک محبوس باغیچے ہی

میں پھل سکتا ہے اور مصنوعی روشنی، مصنوعی حرارت اور مصنوعی غذائیت کا محتاج ہے ۔ ڈرائنگ روم، ریشمیں ساڑیاں، برقی قمقمے، مصنوعی چلتے ہوئے فقرے، میں حیران ہوں کیا واقعی مجھے اوشا سے محبت تھی یا شاید یہ اس غیر فطری ماحول کا اثر تھا جو باہر کی کھلی اور خوشگوار فضا میں پہنچ کر مٹ گیا ۔

یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں ۔ رم جھم، رم جھم بارش ہوتی ہے اولے پڑتے ہیں، برف گرتی ہے ۔ پھر ہوا کے چند تیز و تند جھونکے آتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے ۔ آسمان خوش نما نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں اور پر پھیلائے ہوئے ۔ ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین نظر آتی ہے ہم اپنے خیمے کا جالی دار پردہ کھولتے ہیں ۔ گرم کافی کی پیالی ہاتھ میں، بندوق کاندھے پر لٹکائے باہر نظر دوڑاتے ہیں ۔ چاروں طرف برف ہے، ہوا خاموش ہے، آسمان صاف ہے ۔ ہم آہستہ آہستہ کافی پیتے اور چمڑے کے جوتوں کے اوپر دھان کے خوشوں سے بنے ہوئے جوتے پہن لیتے ہیں اور شکار کی تلاش میں چل پڑتے ہیں ۔ یہاں شکار بہت ملتا ہے ۔ جنگلی بکریاں، لومڑی، ریچھ اور بھیڑیے آخر الذکر بھولے بھٹکے شکاریوں کو ہی شکار کر لیتے ہیں ۔ پھر رات کے وقت الاؤ کے قریب خیمے میں بچارا چوکیدار اور اس کا جانباز کتا آگ تاپتے ہوئے مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے ۔ کالی رات میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے، بھیڑیے چلاتے ہیں، برف کے تودوں کے گرنے سے ایک مہیب اور خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے جو دور تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے بعد خاموشی مکمل خاموشی ۔ موت اور سکون ۔ شکاری اب کبھی نہیں آئے گا شکار کرتے کرتے وہ خود شکار ہو گیا ۔ اس کی ہڈیاں برف کے تودوں کے نیچے ہیں اور ان پر بھیڑیے ناچ رہے ہیں ۔

لیکن گھبراؤ نہیں دوست ۔ ہم ابھی تک زندہ ہیں، صحیح و سلامت ——

اور اب تک ایک درجن کے قریب ریچھوں، لومڑیوں اور بھیڑیوں کو گولی کا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نشانہ بن چکے ہیں۔

جس جگہ ہمارا کیمپ ہے اس سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل نیچے مغرب کی طرف گرجن کا دلکش مقام ہے۔ اس سے زیادہ دلکش جگہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ یہاں سے پورے دو میل بھی نہ ہوگا، لیکن اُف! کتنا دشوار گزار راستہ ہے اور پھر ایک جگہ اس قدر پھسلن ہے کہ ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہوا، توازن برقرار نہ رہا تو چشم زدن میں سینکڑوں فٹ نیچے برف سے اٹی ہوئی کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اب تو ہم اس راستے سے کسی قدر واقف ہو گئے ہیں، لیکن پھر بھی متواتر برف و باراں سے ہر روز نیا راستہ تراشنا پڑتا ہے اور پھر بھی دل جمعی سے چلتے چلتے دائیں یا بائیں نیچے نظر پڑ جاتے تو ان بے پناہ گہرائیوں کو دیکھ کر سارے جسم میں بے اختیار جھرجھری سی آجاتی ہے۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ہزاروں سیاحوں کو، جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، یہ معلوم نہیں کہ گرجن گلمرگ سے کس قدر نزدیک ہے۔ گرجن میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے ہیں تو کہیں ایسے ہموار تلے جن پر گرمیوں میں ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس اُگتی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑ کی شکنوں میں تنگ کے تناور درخت کھڑے ہیں جو برف و باراں میں محفوظ خیموں کا کام دیتے ہیں۔ یہاں پانچ جھیلیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور خوش نما۔ سب سے بڑی جھیل کو نندن سر کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین میل لمبی چوڑی ہوگی۔ سال میں دس مہینے یخ بستہ رہتی ہے لیکن جب ہم نے اُسے دیکھا گہرے نیلے رنگ کا ایک تختۂ آب بن رہی تھی اور چاروں طرف پیلے پیلے جنگلی پھولوں سے مرصع تھی۔ یہ جھیلیں غالباً دنیا کی سب سے اونچی جھیلوں میں سے ہوں گی اور اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں جب تمام دنیا زیر سطح آب تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ ہمالیہ کے پہاڑ نمودار ہوئے تو یہ جھیلیں وہیں پانی کے گڑھوں کی مانند رہ گئیں۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو ہے کہ ہزاروں سیاحوں کو، جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، یہ معلوم نہیں۔ نہ سیاح، نہ موٹریں، نہایت دشوار گزار راستے ہیں جو سال میں صرف تین چار ماہ کھلے رہتے ہیں اور جن پر جفاکش اور خانہ بدوش گڈریے اپنے ریوڑوں کو گرجن کے مرغزاروں میں چرانے کے لیے لاتے ہیں اور اگست کے پہلے ہفتے ہی میں پھر نیچے کی آبادیوں میں چلے جاتے ہیں۔ شاذ ہی یہاں کوئی سیاح آنکلتا ہے۔ شکار کا شوقین یا تنہائی کا دلدادہ۔ اور پھر اُسے شاذ ہی واپس جانا نصیب ہوتا ہے۔ پھر یہیں کہیں برف کے تودوں میں یا بھیڑیوں کے پیٹ میں یا ان تناور تنگوں کے قریب اس کی قبر بنتی ہے۔ اس لحاظ سے گرجن بہت بدنام ہے اور گڈریے تو گرجن دیوتا کو پوجتے ہیں جو اس پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے جہاں ہمارا کیمپ ہے۔ گرجن کے دیوتا کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا لیکن کہا جاتا ہے کہ گرجن کے دیوتا کو پردیسیوں، مسافروں اور سیاحوں سے بہت نفرت ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ماسوا ان پہاڑی گڈریوں کے، جو اُسے پوجتے ہیں، اور کسی کا بھی اس کے علاقے میں گزر ہو۔ گڈریے جانتے ہیں کہ گرجن دیوتا جس پر ناراض ہوتا ہے اُسے موت کی سزا دیتا ہے اور جس پر خوش ہوتا ہے اس کی بکریوں میں دودھ زیادہ کر دیتا ہے، اس کی بھیڑوں کو نہایت خوبصورت ملائم ریشم سے ڈھک دیتا ہے، برف میں، جھکڑ میں، طوفان میں، ہر حالت میں اس کے ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔

گرجن کی ایک دل فریب شام کا ذکر ہے میں، جگدیش اور ریوا ایک پہاڑی شکاری جسے ہم گڑائی کے علاقے سے اپنے ساتھ لائے تھے، شکار کھیل کر واپس کیمپ کی طرف جا رہے تھے اور راستے میں نندن سر کے مقام پر بیٹھ کر سستانے لگے تھے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ ہوا میں ایسی خنکی تھی کہ سانس میں برف کے لطیف گالے منہ کے اندر جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر اُجلے اُجلے بادل منڈلا رہے تھے، بادلوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عالی شان محل کے نیلگوں فرش پر ایک طلائی ستون کھڑا ہے اور ایک مرمریں محراب کو سہارا دے رہا ہے ۔

ننھا جگدیش نے پانی کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینکا ۔ ارتعاش پیدا ہوا اور دوسرے لمحے میں وہ خوبصورت محل اور طلائی ستون تھرتھرا کر لاکھوں جواہر ریزوں میں بکھر گیا ۔ اب پانی کی سطح پر لاکھوں سورج متلاطم تھے ۔ جگدیش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑ کر ایک گچھا بنایا اور اپنے کوٹ پر ٹانکتے ہوئے بولا: "کتنے خوبصورت پھول ہیں ۔ ان کی مہک ۔ یہ مست کر دینے والا کیف آور عطر ۔ ریوا ، ان خوبصورت پھولوں کا کیا نام ہے ؟"

ریوا کسمسایا ۔ وہ برفوں کی قسمیں پہچانتا تھا ، ریچھوں کو دو میل کی دوری سے سونگھ لیتا تھا ، اس کی نیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی جو سن کی طرح سامنے سے اڑنے والے سنہرے پر نشست لگانے میں بھی کبھی غلطی نہ کرتی تھیں ، لیکن وہ ان پھولوں کے نام نہ جانتا تھا ۔ اچھا شکاری کبھی اچھا شاعر نہیں ہوتا ۔ اس کے بھورے رخسار اور بھی بھورے ہو گئے اور وہ رک رک کر بولا: "مجھے ــــ پتا ــــ نہیں ۔"

جگدیش کو ریوا کی بے چینی میں بہت لطف آیا ۔ پھر وہ آہستہ سے بولا ،
"ٹھیک ہے ، ان پھولوں کے نام سے کسی کو آگاہ نہ ہونا چاہیئے ۔ شاید ان پھولوں کا کوئی نام ہی نہیں اور یوں بھی خوبصورتی کا کوئی نام نہیں ہوتا ، حسن کی کوئی ذات نہیں ۔"

میں نے مسکرا کر احتجاجاً کہا: "جملہ حقوق محفوظ ، تم میری باتیں دہرا رہے ہو ۔"

ریوا بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا ۔

جگدیش نے مزاحاً کہا: "ہونہہ ۔ جملہ حقوق محفوظ ! شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم اوشا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو ۔ ارے بھلے مانس ، یہ گرجن ہے

www.angoothachaap.blogspot.com

گرجن !"

جگدیش نے یہ فقرہ بمشکل زبان سے ادا کیا ہو گا کہ بادل زور سے گرجا ۔ یہاں موسم کتنا غیر معین ہے ! پل میں دھوپ ، پل میں برف و باراں ۔ ریوا نے ایک نظر بھر کر ان بادلوں کی طرف دیکھا جو ابھی گرجن کی چوٹی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے ۔ اس نے نتھنے پھیلا کر شمالی ہوا کو سونگھا اور پھر اپنے فر کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا: "جلدی چلو ۔ طوفان آ رہا ہے ۔"

ہم نے اپنی سمور کی ٹوپیاں پھولوں کے تختوں سے ڈھونڈ نکالیں اور انہیں پہن کر چل کھڑے ہوئے ۔ اگرچہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی ۔ لیکن کئی جگہوں پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے مختلف حصوں پر سفید بادل اپنا سایہ ڈال رہے تھے ۔ ہوا کی خنکی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور ہمیں تو ابھی بہت اوپر اپنے کیمپ تک پہنچنا تھا ۔ ہم جلد جلد لیکن خاموشی سے راستے پر چڑھتے جاتے تھے ۔ گرجن کی چوٹی پر سے بادل نیچے کی طرف پھسل رہے تھے ۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چلنے لگا تھا اور کہیں کہیں روئی جیسی پتلی اور ہلکی دھند ہمارے سامنے ہی آ جاتی تھی ۔ ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی ، لیکن کوئی پون گھنٹہ کے سفر کے بعد طوفان نے ہمیں آ ہی لیا ۔ ہلکی ہلکی بارش اور پھر کہر پڑی اور اس کے ساتھ فوراً ہی برف گرنی شروع ہوئی ۔ ریوا سب سے آگے تھا ، درمیان میں جگدیش اور آخر میں مَیں ۔ ہم تینوں کی کمر میں ایک ہی رسی بندھی ہوئی تھی ۔ ریوا ہمارا رہنما تھا ۔ چند رہ بیس منٹ اور چلے ۔ یکایک میری کمر کو ایک سخت جھٹکا لگا ۔ بہت سخت اتنا کہ اگر میرے حواس برقرار نہ رکھ سکتا ۔ اب میں برف کے سہارے کھڑا زور لگا رہا تھا کیونکہ رسا بائیں طرف جھکا ہوا تھا ۔

چاروں طرف دھند چھا چکی تھی ۔

اوپر سے ریوا کی آواز آئی: "سنبھل جاؤ ۔ سنبھل جاؤ ۔"

"کیا ہوا ؟" میں نے چلا کر پوچھا ۔

www.ma-elibrary.blogspot.com

جگدیش کی آواز آئی "میں برف پر گر گیا ہوں۔ اُف کتنا درد ہے۔ اٹھا نہیں جاتا۔ پاؤں میں ضرب آ گئی ہے۔"

"اُٹھو، اُٹھو۔ کوشش کرو۔" میں نے رسی پر زور سے جھٹکا لگاتے ہوئے کہا۔

طوفان نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ دھند سفید تھی لیکن تاریکی سے بھی بدتر۔ میرے اور ریوا کے درمیان جگدیش کہیں بیچ میں برف پر گرا ہوا تھا اور ہم اسے اٹھا نہ سکتے تھے۔

ریوا کی آواز آئی: "توازن ٹھیک رکھو۔ رسی کو دائیں طرف جھٹکا دو۔ ایک ... دو ... تین۔"

بڑا زور لگایا لیکن جگدیش اُٹھ نہ سکا۔

آخر رسی کو ڈھیل دیتے ہوئے اور برچھے سے کچی گرہیں باندھتے ہوئے میں، ریوا اور جگدیش تینوں ایک مقام پر مجتمع ہو گئے۔ میں نیچے سے چل کر اُوپر جگدیش کے پاس پہنچ گیا اور اسی طرح ریوا اُوپر سے نیچے کو آتا ہوا جگدیش کے پاس آ گیا۔ جگدیش گھٹنوں کے بل پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا جگدیش؟" میں نے جھک کر جگدیش کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جگدیش سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا مگر پھر فوراً برف پر بیٹھ گیا۔ "مجھ سے تو اب چلا بھی نہ جائے گا۔ پاؤں میں ضرب آئی ہے۔"

چاروں طرف سفید دھند چھا گئی تھی۔ ہوا میں ایک وحشیانہ تیزی تھی۔ برف خاموشی سے گر رہی تھی۔

"ہو ... ہوآ ... آآآہو ... ہوآ ... آآآ...

... ہو ..."

ریوا نے دو بار سیٹی بجائی۔ سیٹی کی تیز آواز کسی نوک دار خنجر کی طرح تلملاتی ہوئی طوفان کو چیرتی ہوئی گزر گئی اور پھر چاروں طرف سناٹا

چھا گیا۔

"ہوآ ... آ ... آہو، ہوآ ... آ ... آ ... آ ...

ہو۔"

ریوا نے چند لمحوں کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

ریوا نے ایک تحقیق وقفے کے بعد پھر سیٹی بجائی اور ہم تینوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے جواب کے منتظر رہے۔ لیکن کانوں میں بڑھتے ہوئے طوفان کے وحشیانہ قہقہے تھے۔ سردی دم بدم بڑھ رہی تھی، ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے آنکھوں میں نیند آ رہی تھی۔

"مت سوؤ۔ جگدیش مت سوؤ۔" ریوا نے سیٹیوں کے درمیانی وقفے میں کہا

میری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار چھا رہا تھا، پپوٹے بند ہوئے جاتے تھے۔ جانتا تھا کہ مجھے سونا نہ چاہیئے، جانتا تھا کہ یہ خمار موت کا خمار ہے، یہ نیند اجل کی نیند ہے۔ آخری اور کبھی نہ ختم ہونے والی نیند۔ پھر بھی آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں اور جگدیش بیچارا تو بالکل اونگھ رہا تھا۔

ریوا نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا: "میری بات سنو، دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔ اپنی مٹھیوں میں برف بھینچ لو۔ زور سے۔ زور لگاؤ۔ اور ..."

"ہوا آآآ ... ہو ... ہوآآآ ... ہو۔" دور نیچے سے کسی مدھم سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوا نے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوا نے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز اب معلوم ہوا کہ دور دور پھیلتی جا رہی ہے اور خطرے کا سگنل دے رہی ہے، امداد کے لیے پکار رہی ہے۔ اس سیٹی میں کتنا خوف تھا، کتنی التجا، کتنا درد، کتنی امید! ہمارے کان اس کے جواب کی طرف لگ گئے۔ کیا سچ مچ سیٹی کا جواب آیا تھا، کیا یہ محض ایک واہمہ تو نہ تھا؟ مگر نہیں۔ دور نیچے کہیں سے سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مدھم، میٹھی، امید دلانے والی! اس برفانی طوفان میں وہ سیٹی روشنی کے مینار کی طرف

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

چمک اٹھی۔

تھوڑے توقف کے بعد ریوا نے پھر سیٹی بجائی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جواب آیا۔ ایک سیٹی کہہ رہی تھی۔ "ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔" دوسری کہہ رہی تھی "گھبراؤ نہیں۔ ہم آ رہے ہیں۔" دوسری سیٹی نزدیک آتے آتے پھر دور ہو جاتی۔ شاید راستے سے پرے ہٹنا پڑا ہوگا۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ آدھ گھنٹہ اور۔ اب آنے والا ہمارے نزدیک ہی کہیں تھا۔ چند منٹ اور اضطراب میں گزرے۔ اب ہمارے سامنے ایک جفاکش ادھیڑ عمر کا پہاڑی کھڑا تھا۔ اس کی چھاتی پر ایک لالٹین بندھی تھی جس کی مدھم روشنی اس تاریک دھند کو چیر کر بمشکل ایک دو گز دور تک جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھریرے بدن کا جوان کھڑا تھا لیکن دھند میں ان کی صورتیں اچھی طرح پہچانی نہ جاتی تھیں، بس سائے سے معلوم ہوتے تھے۔

جفاکش پہاڑی نے پوچھا "کیا بات ہے، طوفان میں کیسے گھر گئے؟"

ریوا نے جواب دیا "ہمارے ساتھی کو چوٹ آ گئی اور ـــ" اس نے فقرہ نا تمام رہنے دیا۔

جفاکش پہاڑی چند منٹ تک چپ رہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

چند منٹ آرام کرنے کے بعد پہاڑی نے چھریرے بدن کے جوان کو جگدیش کی طرف اشارہ کرکے کہا "اسے اٹھا لو۔ میں بمشکل راستے کی رہنمائی کر سکوں گا۔"

چھریرے سائے نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا، پھر وہ جھکا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے جگدیش کو اٹھا کر اپنی پشت پر گردن کے قریب رکھ لیا۔ دوسرے پہاڑی نے ایک رسی سے جگدیش کی ٹانگیں اس کی کمر سے باندھ دیں پھر ایک رسا اپنی کمر سے باندھ کر اس جوان کی کمر کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ رسا مجھ

تک پہنچا۔ میں نے اُسے کمر میں باندھ کر ریوا کے حوالے کیا۔ آخر میں ریوا نے اُسے مضبوطی سے اپنی کمر میں باندھ لیا۔

"تیار رہو۔" پہاڑی نے ہمیں چوکنا کرتے ہوئے کہا "رسہ پیچھے مضبوطی سے تھامو۔ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ دو ۔ ۔ ۔ تین" اور اس طرح رات کی تاریکی میں، برف کے خطرناک سمندر میں یہ کارواں از سر نو گرجن کو چلا۔

پہاڑی کا گھر ایک ٹنگ کے نیچے۔ وہاں پہنچ کر اس نے جلدی سے دو تین کھالیں نکال کر زمین پر بچھائیں اور دوسرے پہاڑی نے جگدیش کو وہاں لٹا دیا۔ جگدیش بے ہوش تھا یا شاید برف کی نیند سو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا پہاڑی ٹنگے کی کوکھ کے اندر گیا اور وہاں سے اپنی مٹھی میں ایک گول مڑی ہوئی چمڑے کی تھیلی سی باہر لایا۔ الاؤ کی سرخ روشنی میں میں نے دیکھا۔ یہ ایک نافہ تھا۔

"روشنی لالٹین بجھا دو۔" پہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا جو اب ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک لمبے سانس کی آواز سنائی دی اور پہاڑی کا ساتھی الاؤ کی طرف بڑھا۔ اُسے تاریکی سے روشنی میں آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اب اس نے سمور کی ٹوپی اتار پھینکی تھی جس نے اس کے لمبے بالوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں تکان سے نیم وا تھیں اور جبین پسینے سے تر تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس نے پہاڑی کی کمر سے لالٹین کو کھولا اور ایک پھونک مار کر اسے بجھا دیا پھر لالٹین ہاتھ میں لے کر سر کو ایک طرف جھکاتے ہوئے وہ واپس اندھیرے میں چلی گئی۔

پہاڑی گھٹنوں کے بل جھک گیا اور جگدیش کے تنفس پر غور کرنے لگا کچھ عرصے کے بعد اس نے لکڑی کے بڑے چمچے میں تھوڑا گرم دودھ اور نافہ ڈال کر ہلایا اور اُسے جگدیش کے منہ میں انڈیل دیا۔ ایک اور چمچے میں اس نے کوئی اور

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

چیز گرم کی جو غالباً کسی جانور کی چربی معلوم ہوتی تھی اور بہت بدبودار تھی جب وہ چربی بھی گرم ہو کر سیال بن گئی تو اس میں بھی اس نے تھوڑا سا نافہ ڈال دیا اور اُسے انگلی سے ہلاتے ہوئے ذی شی کو پکارا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟" ذی شی نے وہیں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے [illegible] آواز سست اور مضمحل تھی۔

"ادھر آنا بیٹا۔ ذرا ان کی کنپٹیوں کو سہلاؤ۔ یہ لو روغن۔"

ذی شی نے جگدیش کا کن ٹوپ اتار دیا اور اس کا سر اپنی گود میں لے کر اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ پہاڑی تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ الاؤ کے سرخ ہالے میں پہاڑی کا شکن آلود چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی کسی قدر مضبوط تھی اور گردن کی رگیں باہر کو تنی ہوئی تھیں۔ جگدیش کا سانس کبھی دھیما ہو جاتا کبھی تیز چلنے لگتا۔ کبھی اس میں گھر گھر کی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے کسی گھڑی کو چابی دیتے وقت سنائی دیتی ہے۔ لڑکی دھیرے دھیرے کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔ اس کے سہلانے سے چڑ چڑ چڑ کی ایک عجیب خواب آور سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں ادھ مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جگدیش پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں تھا اور آدھا الاؤ کے ہالے میں۔ میں اس کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ یہ آرین اور منگول خطوط کا ایک حسین مرقع تھا۔ زعفران اور گلاب کے رنگوں کا ایک دلربا امتزاج اس کے غلافی پپوٹے اس طرح جھکے ہوئے تھے کہ آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں ذی شی — معاً میرے دل میں خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں ایک خواب ہے یہ جوان لڑکی، یہ پہاڑی دیوتا، یہ تنگ کا تنا، یہ سرخ الاؤ، یہ سب کچھ ایک طویل خواب ہے۔ شاید میں اوشا کے بیٹھنے کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا اس سپنے کو دیکھ رہا ہوں اور وہ ابھی ابھی ایک نیلی ساڑھی پہن کر اندر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر اپنی تحقیر آمیز ہنسی سے مجھے جگا دے گی۔ "اٹھو بے فکر آلو، ساڑھے پانچ بج گئے۔"

ایڈی کنٹر کا ظلم — میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ قدرے توقف کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو وہی منظر تھا۔ پہاڑی درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ لڑکی جگدیش کا سر سہلا رہی تھی۔ جگدیش کا تنفس اب صاف چل رہا تھا۔ الاؤ کا ہالہ تنگ ہو گیا تھا، تنگ ہو رہا تھا۔ اونگھتے جاگتے پلکیں جھپکتے جھپکتے، اس خوبصورت تصویر کو دیکھتے دیکھتے، آہستہ آہستہ یہ سارا منظر ایک سکون ریز دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

جب دوسرے دن آنکھ کھلی تو نہ جگدیش تھا نہ وہ جوان لڑکی۔ پہاڑی بوڑھا بھی غائب تھا۔ میں اکیلا تنگ کے وسیع سائے میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ کل جو کچھ دیکھا تھا محض ایک افسانہ تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پہلے تنے کی کوکھ نظر آئی، پھر دور پرے دھوپ میں ایک ریوڑ چرتا ہوا نظر آیا۔ ڈھارس بندھی، زور سے آواز دی۔

"جگدیش — او جگدیش!"

ریوڑ میں سے دو ایک بکریوں نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"جگدیش" میں زور سے چلایا "او جگدیش۔ نامعقول جگدیش"

یکایک تنے کی کوکھ سے پہاڑی مسکراتا ہوا نکلا: "گرجن دیوتا کی مہربانی سے کل آپ کی جان بچ گئی"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پہاڑی کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگا "شکریہ! تمہارا اور تمہاری بہادر لڑکی کا ہزار بار شکریہ۔ کیا نام ہے اس کا؟ ذی شی؟"

"ہاں، ذی شی اس کا نام ہے۔ میری ننھی ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن دیوتا اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے واقف ہے۔ اسے گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ چھوٹی عمر ہی میں اس کی ماں مر گئی تھی۔ گرجن دیوتا ہی نے پالا ہے۔ گرجن دیوتا ذی شی سے بہت

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

محبت کرتے ہیں۔"

ایک گرجن دیوتا پہ ہی کیا موقوف ہے، میں نے دل میں سوچا، اس سے تو ہر ایک کا دل محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے پہاڑی بڈھے سے پوچھا

"جگدیش کہاں ہے؟"

پہاڑی نے جواب دیا۔ "صبح جب اُن کی آنکھ کھلی تو پاؤں کی موچ بالکل نکل چکی تھی۔ اب وہ ذرا نندن سر تک سیر کرنے کو گئے ہیں۔ ذی شی کو میں نے ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں اب واپس آتے ہی ہوں گے۔ آپ تو خوب سوئے؟"

ہاں میں تو خوب سویا، میں نے دل میں سوچا، کیونکہ رات بھر کسی نے میری کنپٹیوں پر مالش نہیں کی۔ وہ دونوں؟ یہ لفظ سن کر میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پیدا ہوئی، ایک خفیف سا انتشار۔ کمبخت جگدیش ہر بار بازی لے جاتا ہے۔ میں نے پہاڑی سے آہستہ سے پوچھا "نندن سر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"یہی کوئی کوس بھر۔ سیدھے اس طرف۔ وہ!"

"اچھا میں بھی نہا دھو آؤں۔" بوڑھے سے یہ کہہ کر میں چلتا بنا۔

میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جگدیش نہ تو لارڈ بائرن کی طرح لنگڑا ہے اور نہ ڈان جوان کی طرح حسین، پھر بھی یہ کم بخت عورتیں کیوں اس پر اتنی جلدی فدا ہو جاتی ہیں؟ کیا اس دنیا میں ہم ہی مہاتما گاندھی رہ گئے ہیں؟ آخر ہمارے پہلو میں بھی ایک حساس دل ہے۔ سوز، تڑپ، شعریت سب کچھ ہے۔ مگر اس پر بھی سب ہمیں ایک گھن چکر سمجھتے ہیں۔ آخر یہ تفاوت کیوں؟ جگدیش میں ایسے کون سے لعل لگے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں پر عینک جما کر شترمرغ کی طرح چھاتی نکال کر چلنے سے کون سے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ چڑیل اوشا بھی اس پر مرتی تھی، کمبخت! یونہی سوچتے سوچتے، دل ہی دل میں کڑھتا ہوا چلا

جا رہا تھا کہ یکایک سامنے سے ایک دلکش ہنسی اور پھر ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سامنے کے ٹیلے پر سے جگدیش اور ذی شی چلے آ رہے تھے۔ دونوں نے لمبے سموری فرغل پہن رکھے تھے۔ دونوں کے سروں پر سموری ٹوپیاں تھیں جن پر ایک طرف کو پیلے پیلے پھولوں کے گچھے بندھے تھے۔ جگدیش کا بلند قہقہہ مجھے بہت ناگوار گزرا۔

"اتنی دیر سوئے رہے؟" جگدیش نے سوال کیا۔ سوال کیا تھا سراسر تضحیک تھی۔

"اتنی جلدی جاگ اٹھے؟" میں نے جواب دیا۔ جواب کیا تھا سراسر طنز تھی۔

"نہانے چلے ہو؟" جگدیش نے پوچھا۔

"پاؤں کی موچ نکل گئی ہے کیا؟" میں نے جواب دیا۔

ذی شی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا اور اپنا بایاں بازو میرے بازو میں ڈال کر کہنے لگی "آؤ ہم تینوں واپس نندن سر چلیں۔" جب ہم نندن سر کو چلے تو جگدیش اپنی عینک صاف کر رہا تھا اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اے پُرفتوح چینہ تو نے اس وقت تو ہم دونوں کو خوش کر دیا لیکن جلد یا بدیر تجھے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے؟

اور جلد ہی اس امر کا فیصلہ ہو گیا۔ میں نندن سر پہ نہاتا رہا اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں میں نیم پنہاں خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی ہنس پڑتے، پھر کوئی کان میں ایک دوسرے کو کچھ کہتے، ایک دوسرے کی طرف پھول توڑ توڑ کر پھینکتے۔ جگدیش نے خدا جانے آہستہ سے کیا کہا کہ ذی شی یکایک بھاگ اٹھی۔ جنگل کی مست ہرنی کی طرح۔ جگدیش اس کے پیچھے اٹھ کر دوڑنے لگا۔ ہاں واقعی پاؤں کی موچ نکل چکی تھی۔ پھولوں کے تختوں میں اس نے کئی چکر کھائے۔ مگر ذی شی کہاں اس کے قابو میں آتی تھی۔ اس کے لانبے لانبے سیاہ بال ہوا میں لہرا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

رہے تھے اور وہ بھاگتی ہوئی پھولوں کے تختوں سے پرے ٹیلوں پر سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دو دِھل کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔ جگدیش بھی بھاگتا بھاگتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف سمندر کی دو ٹوپیاں پڑی تھیں اور پھولوں کے مسلے ہوئے تختے۔ برف کی طرح سرد پانی نے جسم اکڑا دیا تھا اور ہونٹ نیلے کر دیے تھے۔ میں نہا کر بہت دیر تک دھوپ تاپتا رہا۔ آج گرجن دیوتا کی چوٹی پر بادلوں کا نشان بھی نہ تھا۔ میں پہاڑ پر اس سلوٹ کو ڈھونڈنے لگا جس کے اندر خیمہ تھا۔ لیکن وہ سلوٹ یہاں سے نظر نہ آتی تھی۔ جگدیش اور ذی شی کہاں گئے؟ یہ سوچ کر میرا منہ لال ہو گیا۔ اب تو گرجن ہی کو اپنی قیام گاہ بنانا ہو گا۔ آج ریلا کو کہنا ہو گا کہ مزدوروں کو ساتھ لے جائے اور خیمہ اور دیگر سامان اٹھوا کر یہاں لے آئے اس برفانی سلوٹ سے تنگ کی بستی زیادہ محفوظ جگہ ہے، اور اگر کل کی ایک اور ایسی ہی برفانی اور طوفانی شام آ گئی تو گرجن دیوتا کی بددعا پوری ہو جائے گی۔

اب بدن اچھی طرح سے گرم ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی تھی دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ راستے میں پھر مجھے جگدیش اور ذی شی مل گئے۔ ذی شی کے رخساروں کی لالی بڑھ گئی تھی، اس کی آنکھیں نیچی تھیں؛ جگدیش کی چھاتی ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک نئے بھرتی شدہ لفٹیننٹ کی طرح۔ اس بار ذی شی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیٹا صبر کرو۔ رونے دھونے سے کیا ہوتا ہے؛ ایسے کئی جرکے تم کھا چکے ہو۔

گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گزرتی ہے۔ اس سپنے میں ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریے اور ان کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے کے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں، کودتے ہیں، ناچتے ہیں، مَیں مَیں باں باں کرتے ہیں۔ کبھی ناکام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ گڈریے بینڈھوں کو

لڑاتے ہیں۔ شرطیں بدتے ہیں، ہارتے ہیں، الغوزے بجاتے ہیں، شکنجہ کھینچتے ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی افق کی آخری لال دھاری تاریکی میں گم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں تلے لے آتے ہیں، الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن اور مکئی کی روٹی۔ کبھی یا گڑ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور سرخ مرچیں بھی آ جاتی ہیں ورنہ اکثر دہی دودھ اور دودھ اور مکئی کی روٹی، دہی اور مکھن۔ چنیر گرجن میں چرواہے اور چرواہی کے جسم سے سوندھی سوندھی بُو آتی ہے جو اکثر شہری طبیعتوں کو بہت بری معلوم ہو گی۔ لپنڈا اپنی اپنی۔ غازہ اور پوڈر اور لپ سٹک کی جگہ چرواہیاں یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں۔ تیل کی جگہ بھی مکھن۔ یہاں مٹی کے برتن بہت کم ملتے ہیں۔ دودھ کھالوں میں دوہ کر رکھا جاتا ہے۔ دودھ دوہتے وقت چرواہیاں شرطیں بدتی ہیں۔ کس کی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے؟ کون زیادہ دودھ کی دھاریں اپنے منہ میں ڈال سکتی ہے؟ نیم گرم دودھ کی تازہ دھاریں جب پیاسی زبان سے جا لگتی ہیں تو دل کو وہ فرحت نصیب ہوتی ہے کہ چائے اور کوکو سب بھول جاتے ہیں۔ میرے خیال میں زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی بارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک تنگ کے درخت کے تلے رہے بکریاں چرائے، الغوزے بجائے اور تازہ دودھ کی دھاروں سے مشامِ جان کو ہر دم تازہ رکھے۔ دودھ سے مکھن نکالنے کا طریقہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہاں نہ مٹی کی گھڑی ہے نہ بلونا۔ بس ایک کھال میں اس کے نصف حجم کے برابر دودھ ڈال دیا جاتا ہے اور ایک چرواہی اس کھال کو اچھی طرح سے بند کر کے ایک بچھونے کی طرح گھاس پر لٹا دیتی ہے اور پھر جس طرح آٹا گوندھا جاتا ہے اس طرح کھال کو اپنے ہاتھوں سے بار بار گوندھتی ہے۔ لٹیں بکھری ہوتی ہیں، چہرہ لال ہے، آنکھوں میں چمک ہے زبان پر کوئی پہاڑی گیت ہے اور کھال گوندھے جا رہی ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد کھال کے اندر دودھ اور مکھن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دودھ الگ دوسری کھال میں

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ڈال لیا جاتا ہے اور مکھن ہاتھ سے اتار لیا جاتا ہے۔ دودھ خالص بھی ہوتا ہے اور گاڑھا بھی۔ اس دودھ میں پانی کم اور مکھن زیادہ ہوتا ہے اور جب پیو تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیریں مکھن کا سیال ہے کہ گلے میں اترتا جا رہا ہے۔ اس دودھ کو پی کر نیند بہت آتی ہے۔ ساری زندگی ایک سپنا معلوم ہوتی ہے اور دراصل گرجن ہے بھی ایک سپنا ہی۔ ورنہ ایسے مقام نواب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جا رہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت اور نقلی انسانیت اور پھر زندگی کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت لیے ہوئے ہے۔ الاؤ کے چٹختے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں چرواہیاں اُون سے کچھ بن رہی ہیں۔ تکلی گھوم رہی ہے۔ ان کی باہیں اور چہرے اور آنکھیں ایک خاص ترتیب سے حرکت کرتی ہیں جیسے یہ مکھن تیلیاں ہیں ایک چرواہا کہانی سنا رہا ہے۔ "ریمی کی کہانی تم نے سنی ہے؟ ریمی گرجن کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ وہ تنگوں کے سایوں میں پل کر جوان ہوئی تھی اور نندن سر کی نیلی جھیل کا عکس اس کی دل کش آنکھوں میں چھلکتا تھا۔ اس کی جبین گرجن کی برف کی طرح سپید تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج نے اس کے گالوں کو چوم کر انہیں ہمیشہ دوامی چمک عطا کی تھی۔ ایسی لڑکی کسی دیوتا ہی سے بیاہنے کے لائق تھی کسی چرواہے کو اس سے محبت کرنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے تھی۔ گرجن دیوتا کا سایہ اس پر تھا۔ وہ اکثر دن بھر اکیلی گھومتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے خوف و خطر گرجن کی سب سے اونچی چوٹی پر چلی جاتی۔ شاید اس نے دیوتا کے درشن کر لیے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت پیاری تھی، لیکن افسوس وہ اُسے کسی سے بیاہ نہ سکتے تھے۔ واڈو ایک معمولی چرواہا تھا لیکن اس نے ریمی سے عشق کیا۔ وہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ اسے کئی بار سمجھدار بوڑھے چرواہوں نے سمجھایا لیکن وہ نہ مانا۔ گرجن دیوتا نے بھی اسے کئی بار سمجھایا۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ ایک بار واڈو کو ننگ سر کی گھاٹی میں گرجن دیوتا

ملے تھے۔ چاندنی رات تھی اور گھاٹیں اور چوٹیاں اور میدان ایک رو پہلی خاموشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ نہ ہوا تھی، نہ نغمہ، نہ بادل۔ اور اس خاموش بے حس و حرکت کائنات میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے۔ ریمی اور واڈو۔ واڈو اور ریمی۔ اور واڈو نے جرأت کر کے ریمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عین اسی وقت واڈو کو سامنے ایک سپید برف کا گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اڑتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا اور پھر اس کے سامنے زمین سے آسمان تک برف کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی۔ ریمی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سپید اور واڈو اس لکیر کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ لیکن وہ ریمی کی محبت سے دستبردار نہ ہوا۔ گرجن دیوتا نے اُسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ کس طرح واڈو کو گرجن دیوتا نے رات بھر طوفان میں گھیرے رکھا تھا۔ واڈو کو اس بھیانک رات میں کبھی کبھی گرجن دیوتا کی خشمگیں آواز سنائی دیتی: "ریمی کی محبت سے باز آ، وہ تیری نہیں ہو سکتی۔" کبھی کبھی اُن سے بھیڑ بکریوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی جلتا ہوا الاؤ کسی تنگ کے نیچے نظر آتا۔ لیکن یہ سب گرجن دیوتا کے کرشمے تھے وہ رات بھر طوفان میں گھرا رہا اور جب دوسرے دن وہ گھر پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے ہمیشہ کے لیے نیلے ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ شدت سے ریمی سے محبت کرتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" ایک چرواہی نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

بس گرجن کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہوتی ہے، بچپن کے ہوائی قلعے، معصوم توہمات اور قدرت کے ہیبت ناک مناظر۔ ان کہانیوں میں نہ فن کاری ہوتی ہے نہ عروج نہ پلاٹ۔ گڈریا جو جی میں آئے کہتا چلا جا رہا ہے۔ کہانی آپ ہی آپ بنتی چلی جا رہی ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے کے منہ سے ایک خوبصورت کویا تیار ہو جاتا ہے اسی طرح کہانی کہنے والے کی زبان کہتی چلی جا رہی ہے اور کہانی تیار ہوتی جا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

رہی ہے۔ یہ کہانی اس کہنے والے نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ اُسے خود نہیں معلوم "پھر کیا ہوا؟" لیکن وہ کہتا چلا جا رہا ہے اور رات کے سناٹے میں، الاؤ کی روشنی میں، اُف بنتی ہوئی چرواہیوں کے جھرمٹ میں واٹوادی کے حسین چہرے کے شبستان میں اُجاگر ہو رہے ہیں۔

لیکن ریوا کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ وہ کہانیاں سننا نہیں چاہتا۔ اُسے اعتراض ہے کہ کیوں ہم نے پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر پستی اختیار کی ہے؟ اس کی شاہین کی سی نگاہیں شکار کی تلاش میں زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اسے یہاں کے کھمن کی بنسیوں یا الغوزے بجاتے ہوئے گڈریوں یا گرجن دیوتا کی بے ہیاہ حرکتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ قدرت سے، طوفان سے، موت سے ایک بہادر سپاہی کی طرح مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اوشا کی بے وفائی نے میرے دل میں کیا آگ لگا رکھی ہے اور اب گرجن کی برفانی وادیوں میں ایک نئے الاؤ کے شعلے لپکنے لگے ہیں۔ وہ صرف ایک خوشبو کی تعریف کرنا جانتا ہے۔ جب وہ کبھی رد نسے کو زخمی کر کے فوراً اس کے نافے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتا ہے تو نافے کی تھیلی میں سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی ہیں۔ ہرن جانکنی کی حالت میں ہے، زندگی نافے میں سے خوشبو کی لپٹیں بن کر نکل رہی ہے۔ ریوا اپنے شکار پر جھکا ہوا ہے۔ نافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اور آہستہ چاقو سے چیر کر جسم سے الگ کر ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نافہ ہرن کا شکار کرتے ہوئے فوراً ہی اس تھیلی کو نہ پکڑ لیا جائے تو سارا نافہ ہرن کے جسم میں جذب ہو جاتا ہے اور تھیلی میں ذرا سی بھی خوشبو نہیں رہتی اور نافہ نافہ نہیں رہتا بلکہ محض چربی کی ایک پوٹ۔ ریوا صرف نافے کی تعریف کر سکتا ہے، پنیر کی سوندھی خوشبو سے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں، ذی شی کے کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں بھی بسی پنیر کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جگدیش ایک صاحب ہو کر بھی کیونکر ذی شی سے عشق کر سکتا ہے۔ خود جگدیش کو بھی اس نئے جذبے پر حیرانی سی تھی۔ اس نے اکثر، بلکہ ہم دونوں نے اکثر پہاڑی عورتوں سے عشق کیا تھا، اور یہ عشق ہمیشہ چند سدلیوں، چند حفاظتی تدبیروں اور دو ایک ریشمی رومالوں پر

عشق ہوتا تھا، کبھی ہم اسے شعری جذبہ کہتے تھے۔ کبھی وقتی شادی۔ لیکن ہوتا یہی کچھ تھا، یعنی جھٹ دیکھ لیا، دل شاد کیا۔ لیکن یہ کس بلاخیز طوفان کی آمد تھی کہ ذی شی کو دیکھتے ہی جگدیش اس میں ایسا کھو جاتا تھا کہ سوائے ذی شی کے اُسے دنیا کی کوئی اور چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ یہاں نہ جہیز کا سوال تھا نہ تعلیم کا نہ آداب کا۔ ذی شی ان سب باتوں سے بیگانہ تھی۔ پھر بھی جگدیش اس بے وقوفی پر تلا ہوا تھا۔ وہ ذی شی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ شادی! سمجھتے ہو دوست؟ جگدیش اس بے باک پہاڑی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس نے صوفے کی شکل تک نہ دیکھی تھی، جس کے باپ کے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی؛ جس کی انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھی بھی نہ تھی، جس کے اطوار وحشی پرندے کی طرح تھے۔ گرجن اس سے زیادہ بددعا اور کسی کو نہ دے سکتے تھے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ میں اسے کئی بار سمجھاتا: "پاگل ہوئے ہو؟ گرجن کی زندگی خانہ بدوش گڈریوں کی زندگی ہے، لیکن انسان ایسی قبائلی زندگی سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ تنگ کے تلے نہیں رہتا بلکہ شہر بسا کر رہتا ہے۔ وہ صرف کھمن اور پنیر پر قناعت نہیں کرتا بلکہ زندگی کی صدہا لذتیں اسے میسر ہیں۔ ذی شی پہاڑی تتلی ہے، میدانوں میں تمازت آفتاب سے فوراً جھلس جائے گی۔ تم خود اس سے نفرت کرنے لگو گے۔ کیا سمجھے ہو؟ جس نظام میں تم رہتے ہو اس میں اس قسم کی عورت ایک دن بھی بمشکل گزارا کر سکے گی۔ گھٹ کر مر جائے گی۔ شہری زندگی کا آسمان بہت تنگ ہوتا ہے اور زمین بھی نپی تلی ہوئی۔ وہاں نہ برفانی چوٹیاں ہوتی ہیں نہ سرسبز مرغزار۔ ذی شی تو ایک عجائب گھر میں رکھے جانے کے لائق اور پھر آج کل شادی میں محبت کو کیا دخل؟ قبائلی زندگی میں محبت ہو سکتی تھی لیکن موجودہ زندگی میں اور اس کے زمینی نظام میں محبت کو کیا دخل؟ اس دنیا میں ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزارا جا سکتا ہے لیکن محبت کے جذبے کو اس دنیا میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جب گرجن سے واپس جاؤ گے اس وقت میری باتوں کی قدر معلوم ہو گی۔ اس وقت تمہیں اوشا یاد آئے گی۔ ذی شی تو سینما بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا بچوں کی سی باتیں

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کرتے ہوا جگ ہنسائی ہوگی۔ لوگ کہیں گے۔ جگدیش چڑیا گھر سے ایک جانور پکڑ لایا ہے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ شاید عمر میں پہلی بار اُسے کسی سے محبت ہوئی تھی وہ محبت جو چند روپوں، چند حفاظتی تدبیروں اور چند ایک ریشمی رومالوں پر مشتمل نہ تھی۔ یہ کسی انوکھی آگ کا شعلہ تھا جو اس کی روح کے ہر کونے میں کوندتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ پہلے پہل ذی شی ہم تینوں کے ساتھ شکار کے لیے جاتی تھی۔ اس نے بندوق چلانا بہت جلد سیکھ لیا تھا اور کچھ دنوں سے تو وہ ایک مشاق شکاری بن گئی تھی جس کی نگاہیں ریوا کی عقابی آنکھوں سے تیزی میں کچھ ہی کم تھیں لیکن اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکیلے شکار کو جاتے تھے اور ریوا اور میں اکثر مخالف سمت میں جایا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی کسی گھاٹی کی تنگنا میں ہمارا میل ہو جاتا۔ وہ باہنوں میں باہنیں ڈالے چلے آ رہے ہوتے۔ اُن کے کاندھوں پہ بندوقیں ہوتیں، جھولوں میں دن بھر کا شکار، نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے بے اندازہ پیار۔ کبھی کبھی میں انہیں دن ڈھلے کسی گھاٹی کی اونچی چٹان پر کھڑے دیکھ لیتا۔ ان کی پشت میری طرف ہوتی جگدیش کا ہاتھ ذی شی کی کمر میں ہوتا اور ذی شی کا سر جگدیش کے کندھے پر۔ بندوقوں کی نالیاں درختوں کے تنوں کی طرح نظر آتیں جس سے وہ سہارا لیے کھڑے ہوتے وہ نیچے ان وادیوں کی طرف تک رہے ہوتے جہاں شام کی دھند پھیلتی جا رہی تھی اور سورج کا پگھلا ہوا سونا دھند کی سفید لہروں پر تیرتا نظر آتا تھا۔ ساری فضا میں خاموشی ہوتی اور اس گہری خاموشی میں صرف دو دل دھڑک رہے ہوتے۔ میں ان دلوں کا گیت سن سکتا تھا۔ یکایک ریوا بندوق سیدھی کرتا اور "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ایک مہولہ زمین پر آ گرتا۔ جگدیش اور ذی شی چونک جاتے جیسے ان کے سنہرے سپنے کے تار بکھر اُٹھے ہوں۔ بندوق کی گونج گھاٹیوں میں بار بار گونجتی ہوئی پھیلتی جاتی۔ جیسے گرجن دیوتا گرج رہے ہیں۔

جگدیش بے بس تھا لیکن یہ جانتا ضرور تھا کہ یہ محبت میدانوں میں پہنچنے کی

نہیں۔ وہ اس سندر سپنے کو ابدی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن سپنے آخر سپنے ہوتے ہیں، ان کی اپنی فضا ہوتی ہے، ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے، اور جب یہ ہماری دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چیخ کر ٹوٹ جاتے ہیں اور آواز بھی نہیں آتی۔ کئی لوگ اس دنیا میں سندر سپنوں کو ابدی بنانا چاہتے ہیں۔ کبھی محبت، کبھی انسانیت، کبھی اخوت، کبھی مساوات ۔ ۔ ۔ ۔ پانی کے بلبلے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس دنیا کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی فضا میں نہیں پھول پھل سکتیں۔ ان کے لیے ایک نئی فضا کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے ہمیں اس ساری دنیا کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا ہوگا اور ایک نئی دنیا آباد ہوگی۔ جگدیش جانتا تھا کہ یہ کتنا آسان ہے لیکن کرنا بہت مشکل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے واقعی اپنے سندر سپنے کو ابدی کر لیا ہے۔ مجھے وہ طوفانی رات نہیں بھولتی جب اسی تنگ کے درخت کے نیچے میں، ریوا اور بوڑھا لپو تارات بھر جگدیش اور ذی شی کا انتظار کرتے رہے تھے۔ برفانی ہواؤں کے فراٹوں نے ریوڑ کو اس طرح اکٹھا کر دیا تھا کہ وہ سب غریب جانور ایک دوسرے کی تھوتھنیوں میں منہ چھپائے پڑے تھے اور کراہ رہے تھے۔ تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا اور بجلی کے پُرپیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے تھے۔ ایک جہنمی منظر تھا جس میں بادلوں کی گرج، ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گزرتی ہوئی برف کے بھیانک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ ریوا نے صبح سویرے ہی آنے والے طوفان کے متعلق ہم سب کو متنبہ کر دیا تھا لیکن جگدیش اور ذی شی نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ ذی شی طوفان سے مطلق نہ ڈرتی تھی اور اس کے علاوہ اس دن وہ کسی رونسے کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ رونسے گرجن پہاڑ چوٹیوں پر گھوم رہے تھے۔ جگدیش اور ذی شی دونوں رختِ سفر باندھ کر شکار کے لیے صبح ہی ان خطرناک بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے جہاں پہلے ہمارا کیمپ تھا۔ میں نے اور ریوا نے انہیں رومال ہلا ہلا کر الوداع کہی تھی۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

یہ آخری الوداع تھی۔ اس رات گرجن کے خوفناک دیوتا نے اپنے محبوب کو اپنی یخ بستہ چھاتی سے ہمیشہ کے لیے لپٹا لیا اور اپنے رقیب کے سینے میں دہی بجلی گھونپ دی جو رات بھر آگ کے پُرپیچ حلقوں میں گردش کرتی رہی تھی۔ یہ گرجن دیوتا کا انتقام تھا۔ دوسرے دن جب ہم چند اور گڈریوں کے ساتھ انہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلے تو ہم نے انہیں پہاڑ کی بلندیوں پر ایک سلوٹ کے نیچے مردہ اور یخ بستہ پایا۔ جگدیش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذی شی کی آنکھیں بھی کھلی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے مر گئے تھے۔ ذی شی برف پر لیٹی ہوئی تھی اور جگدیش اس کا سر اپنے زانو پر رکھے تھا اور سلوٹ کے کناروں سے رات بھر پانی رستا رہا تھا اور اُس نے اُن دونوں کے گرد ایک نیلم کی قبر بنا دی تھی۔ ذی شی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں جیسے مندن سر کی جھیل اور جگدیش کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جگدیش کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا۔ آہ! ان گہرائیوں کا عالم کسی بے کس زخمی سسکتے ہوئے آہو کی فریادوں کا آئینہ دار تھا۔ ہرن جانکنی میں تھا اور زندگی نافے میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ جب سندر سپنے اس دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔

تنگ کے دائرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ الاؤ کے تنگ ہالے میں ریوڑ سویا ہوا نظر آتا تھا۔ چرواہیاں تکلی پھراتی ہوئی اُن سے کچھ بن رہی تھیں۔ چرواہے محویت کے عالم میں ہاتھوں میں تھوڑیاں لیے ایک کہانی سن رہے تھے۔ کہانی سنانے والا چرواہا کہہ رہا تھا۔ بہت دن گزرے اس تنگ کے درخت کے نیچے ایک پہاڑی یونار رہتا تھا۔ اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا نام تھا ذی شی۔ ذی شی گرجن دیوتا کی منظورِ نظر تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اسی تنگ کے درخت کے سائے میں تین شکاری آکر بیٹھے ....."

ایک چرواہی نے سانس روک کر پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

۱۰۹

پالنا

میرے ہاتھ میں ایک عینک ہے لوگ اسے عینک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں صرف کانچ کے ٹکڑے ہیں۔ جو پلاسٹک کی کمانی میں اس طرح پھنسا دیے گئے ہیں جس طرح سماج کی کمانی میں انسان کی زندگی پھنسا دی جاتی ہے۔ یہ زندگی ٹوٹ سکتی ہے مگر اس کمانی سے باہر نہیں نکل سکتی۔ یہی حال ان کانچ کے دو ٹکڑوں کا ہے۔

مگر پلاسٹک کی کمانی میں پھنسے ہوئے کانچ کے یہ دو ٹکڑے معمولی بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ جب میں انہیں اپنی آنکھوں پر رکھتا ہوں تو میری آنکھوں کو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے، وہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہ آتا تھا۔ یا موہوم، مبہم اور پُراسرار دکھائی دیتا تھا۔ پھیلا پھیلا۔ دھندلکوں میں لپٹا ہوا۔ عینک لگانے پر سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے دھند چھٹ گئی ہو، غبار ڈھل گیا ہو اور ہر چیز فوکس میں ہو۔ میرے خیال میں کانچ کے ٹکڑوں کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ یہ ٹکڑے انسانوں کی آنکھوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں۔ یوں تو ہر انسان..... آنکھیں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا: نگاہ ہوتے ہوئے بھی اندھا رہتا ہے اور ایسا محسوس کرتا ہے۔ جیسے اس کے چاروں طرف اونچی دیواریں ہوں اور بیچ میں اندھیرا ہے؛

مگر یہ کانچ کے ٹکڑے بڑے عجیب ہیں۔ یہ دیواروں کے آر پار دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں روشنی کر دیتے ہیں۔ یہ چاہیں تو وقت تھم جائے آگے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بننے لگے یا پیچھے چلنے لگے۔ جب نظران ٹکڑوں میں سے گزرتی ہے تو روشنی سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے۔ وہ کبھی تو ساری کائنات کا احاطہ کر لیتی ہے اور ایک نقطے پہ مرکوز ہو جاتی ہے۔

میں ہر روز صبح کو اخبار کانچ کے انہی ٹکڑوں کی مدد سے پڑھتا ہوں مگر ان کا برتاؤ میری آنکھوں سے عجیب سا ہوتا ہے مثلاً میں آج صبح کے اخبار میں وہ دھان منتری کی تقریر پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ کانچ کے ٹکڑے شاید کچھ اور پڑھنا چاہتے تھے۔ میں نے جوں ہی پردھان منتری کی تقریر پڑھنی شروع کی میری نظر کے نیچے سے اخبار کے الفاظ پھسلنے لگے۔ پگھل کر اپنی شکل کھونے لگے اور بڑے بڑے دائرے بن کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ میں نے پریشان ہو کر وہاں سے نظر ہٹالی۔ سوچا چلو پردھان منتری کی تقریر نہ سہی کوئی دوسری خبریں پڑھیں گے۔ ذرا معلوم تو کریں افریقہ میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ جاننے کے لیے میں نے اخبار کا صفحہ پلٹا تو میری نگاہ پھسلتے پھسلتے۔ افریقہ کی خبر سے بھی ایک تصویر پہ آ کر رک گئی۔ اور کانچ کے ٹکڑے فوکس میں آ گئے۔ یہ افریقہ کے کسی بڑے نیتا کی تصویر نہ تھی۔ یہ دریا گنج کے ایک یتیم خانہ کی تصویر تھی۔ جس کے باہر ایک پالنا لٹکا ہوا تھا۔ تاکہ لوگ حرامی بچوں کو کسی گندی موری میں ڈالنے یا کوڑے کرکٹ کے کسی ڈھیر پہ پھینکنے کی بجائے اس پالنے میں رکھ جائیں۔ جس قدر عمدہ اور نیک خیال آیا تھا کسی کو! جس کسی نے یہ ترکیب نکالی اس کے ذہن رسا کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہوگا۔ میں نے پلک جھپکا کر بڑے غور سے اس پالنے کی طرف دیکھا اور پلک جھپکتے ہی میں وہاں موجود تھا۔

پکے رنگ کی ایک عورت اس پالنے میں ایک بچہ رکھ کر اور گھنٹی بجا کر جلدی سے واپس جا رہی تھی۔

"ارے۔ ارے۔ ٹھہرو!"

میں نے اس سے چلا کر کہا مگر تیزی سے دوڑی اور نکڑ پر جا کر غائب ہو گئی۔ میں نے ایک پالنے میں پڑے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے میں اس

عورت کی طرف دوڑا اور دوسری گلی کے آخر پہ اسے جا لیا۔ وہ ہانپتی کانپتی ایک ٹی اسٹال کے خالی برآمدے میں بیٹھ گئی۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا:

"تمہیں شرم نہیں آتی؟ اپنا بچہ اس پالنے میں چھوڑ آئی ہو"

مگر بالکل قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اس پہ یوں سوال کرنا ٹھیک نہ تھا۔ کیوں کہ وہ عمر کے اس حصے سے گزر چکی تھی۔ جس میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ بے حد گھبرا چکی تھی۔ اس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور ان پہ سر رکھ دیا:

"کس کا بچہ ہے؟"

میں نے کڑک کر پوچھا۔

"میری بیٹی کا؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔

"کہاں رہتی ہو؟"

"سرکی والاں کی گلی میں"۔

"بچے کو واپس لے جاؤ"

"نہیں لے جا سکتی" بوڑھی عورت نے روتے روتے اپنا سر اٹھا لیا۔

"ابھی تو اپنی بیٹی کو بھی محلے میں واپس نہیں لے جا سکتی۔ لوگ کیا کہیں گے اور برادری کیا کہے گی! میری بیٹی کنواری ہے۔ اس کے باپ کو تو بچہ پیدا ہونے کا علم ہی نہیں ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تو وہ میری بیٹی کو جان سے مار ڈالے گا"

"اور وہ بدمعاش کہاں ہے؟ جس نے۔ جس نے۔؟"

"اس نے اپنا تبادلہ دہلی سے باہر کرا لیا ہے! پہلے تو کہتا تھا کہ شادی کر لوں گا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

پھر چکے سے تبادلہ کرا کے مدراس چلا گیا۔"

"تو اُسے مدراس ہی جا کر پکڑ لو۔ اُس پر مقدمہ کر دو۔"

"کتنی بدنامی ہوگی بیٹا؟ سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ ذرا سوچو میری بیٹی کنواری ہے۔ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے میں کہیں دوسری جگہ اس کی شادی کر سکتی ہوں۔"

میں اُس بوڑھی عورت کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے بڑے میٹھے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"ذرا سوچو تو ماں! تم اس بچے کی نانی ہو نانی! وہ تمہارا نواسہ ہے زندگی بھر شاید تم نے نواسے کو گود میں کھلانے کا خواب دیکھا ہوگا اور آج تم اسے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ آئی ہو۔ ذرا سوچو تو ماں، تمہاری بیٹی کا پہلا بچہ کن حالات میں پلے گا؟ میں تم سے کہتا ہوں ماں! تم اس بچے کو واپس لے جاؤ۔ اُسے ماں کا پیار دو نانی کا لاڈ اور چاؤ دو۔ اُسے بھی تمہارے گھر میں جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہاری بیٹی کو ہے۔ رہا تمہاری بیٹی کی شادی کا سوال، سو ہمارا دیش اب جاگ اٹھا ہے۔ آج تمہیں ہزاروں روشن خیال نوجوان ایسے مل جائیں گے جو تمہاری بیٹی کی دردناک داستان سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

بڑی اچھی تقریر تھی۔ اس وقت میں خود بھی اس تقریر سے اس قدر متاثر ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میری تقریر سن کر اس بوڑھی عورت کے چہرے پر بھی رونق اور اس کی آنکھوں میں امید کی جھلک آگئی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور میری طرف خوشی اور امید سے دیکھتے ہوئے بولی:

"بیٹا! کیا تم — تم — میری بچی سے شادی کرو گے؟"

"میں — میں —؟" میں ایک دم گھبرا گیا۔ میری بات تو اور ہے۔ میرا مطلب ہے کہ — میری شادی ہو چکی ہے!" میں نے جھوٹ بول دیا۔ وہ بوڑھی عورت میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنے سامنے کسی دوسرے حرامی بچے کو دیکھ رہی ہو۔

وہ بہت دیر تک چپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر جب میں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں تو اس نے ایک آہ بھر کر "ہائے رام" کہا اور وہ اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کا سہارا دے کر اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر چپ چاپ وہاں سے چل دی۔

میں پالنے کی طرف جھٹ آیا اور ایک ایسے کونے میں بیٹھ گیا جہاں سے میں پالنے کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن کوئی دوسرا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اُس بڑھیا کے سوال پر بڑا غصہ آیا تھا۔ اُونہہ! گناہ کوئی کرے اور سزا میں بھگتوں۔ عیش کرے دوسرا اور قیمت چکاؤں میں؟ ایسا احمق نہیں ہوں میں! پھر صاحب یہ کہاں کی تُک ہے کہ جو کوئی اچھی تجویز سمجھائے اُسی کے پلے وہ تجویز باندھ دی جائے میرا کہنے کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اس ملک میں سینکڑوں ہزاروں ایسے روشن خیال نوجوان ہوں گے جو — جو — میرا مطلب یہ نہیں کہ میں روشن خیال نہیں ہوں مگر بھئی اب میں نے اپنے ذہن میں اپنی ہونے والی بیوی کی جو تصویر بنا رکھی ہے وہ اس لڑکی سے قطعی مختلف ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ میں ابھی شادی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی زبردستی ہے؟

لیکن مجھے ان عورتوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ جو ماں بن کر اپنی ممتا کو بھول جاتی ہیں۔ اور اپنے ننھے بچے کو ایک یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ جاتی ہیں۔ میں نے سوچا آج میں دن بھر اس پالنے کی نگرانی کروں گا اور میں دن بھر میں ایک عورت کو بھی شرم دلا کے مجبور کر سکا کہ وہ اپنے بچے کو واپس لے جائے تو میرا دن ضائع نہ جائے گا۔

لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک نوجوان لڑکی آئی اور گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک پارسل سا پالنے میں پھینک کر چلی گئی۔ یکایک پارسل رونے لگا۔ میں اس لڑکی کے پیچھے دوڑا۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ کر بھاگی اور گلی کے نکڑ پر ایک سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بچی۔ آخر دو چار گلیوں سے گھومتی گھامتی وہ سامنے سے پلٹ کر پھوارے کی اس سڑک پر آ گئی جو دریا گنج میں شہر کی پرانی فصیل کے کنارے چلتی ہے وہ بار بار مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی اور میں اس سے پچاس گز کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے اس طرح چل رہا تھا جیسے میں اس کا پیچھا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ چہل قدمی کی غرض سے اپنے گھر سے نکلا ہوں۔

دریا گنج سے باہر نکل کر وہ لڑکی فصیل کے باہر دیوار کے ایک کونے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے آصف علی مرحوم کا بت تھا۔ نمائش ہو رہی تھی۔ اس لڑکی کے بالکل قریب بائیں طرف ایک گھڑی کھائی تھی دائیں طرف ایک فلم کا بہت بڑا اشتہار لگا ہوا تھا "دل اپنا، پریت پرائی" میں بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ منہ پھیرے کھڑی تھی: "ہیلو!" میں نے آہستہ سے پوچھا "پریت پرائی کا نتیجہ کیا نکلا؟" وہ یکایک میری طرف گھومی اور مجھے شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی: "اگر تم نے پیچھا کیا تو میں پولیس سے شکایت کر دوں گی۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو۔ اور میری شکایت کر دو اور میں اس لڑکی کی شکایت کر دوں جو ابھی ابھی اپنا بچہ یتیم خانے کے پالنے میں رکھ کر آئی ہے۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"ثبوت تو ڈاکٹر دیں گے!"

میں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی شرربار نگاہیں بجھ سی گئیں، جیسے بجلی کا سوئچ ایک دم آف ہو جائے۔ اس کے خوبصورت سے چہرے پر اندھیرا سا چھا گیا اس کے پتلے پتلے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ دھیرے دھیرے پوچھنے لگی۔

"تم کتنا روپیہ چاہتے ہو—؟"

میں نے پوچھا "تم کتنا دے سکتی ہو؟"

ہمارے سامنے سے پولیس کا ایک سنتری ہمیں گھورتے ہوئے گزر گیا، وہ بے حد گھبرا گئی۔ بولی:

"چلو موٹر میں چل کر بیٹھو، وہاں بات کریں گے۔"

تم! تو تم موٹر میں آئی ہو؟ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ اور ہم دونوں سامنے کا چھوٹا سا پارک کراس کرنے لگے۔ جس میں آصف علی مرحوم کا بت تھا۔ جب میں اس کے ساتھ چل رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ اونچے پورے قد کی لڑکی ہے اور اس کی کمر بڑی دلکشی کے ساتھ لچکتی ہے بالوں سے شونتی کے پھولوں کی مہک آتی ہے اس کی ساڑھی کا کپڑا بے حد مہنگا ہے اس کی گاڑی کا ماڈل صرف دو سال پرانا ہے۔

ہم دونوں پارک کراس کر کے سڑک کراس کر گئے اور اس کی موٹر میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس لڑکی اندر بیٹھ کر اپنے کانوں کی بالیاں اتار دیں۔ پھر اپنے ہاتھ کا منقش کنگن اتارا۔ پھر اپنا پرس کھول کر اس میں سے پانچ سو روپیہ نکالا۔ اور یہ سب کچھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا:

"لو سنبھالو یہ سب، اور میری جان بخشی کر دو۔"

"یہ تو بہت کم ہے۔"

میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو اور تم کیا لو گے؟" مغرور اور بدمزاج لڑکی نے ذرا تیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بچے کو واپس لے جاؤ۔"

"ناممکن ہے۔ میں کنواری ہوں۔"

"کنواری تو نہیں ہو، یوں کہو کہ تم شادی شدہ نہیں ہو!"

"اچھا یونہی سہی۔ پھر؟"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"پھر تم اس شخص سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں جس سے تمہیں ایسی شدید محبت رہی ہے۔ تم بے حد حسین ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تم سے شادی کیوں نہیں کرے گا؟"

"وہ تو کرنا چاہتا ہے مگر میں نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولی۔

"شاید اس واقعے کے بعد تمہیں اس سے نفرت پیدا ہو گئی ہے؟"

میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں مجھے اس سے شدید محبت ہے۔" وہ بولی۔

"تمہیں اس سے محبت ہے؟" میں حیران ہو کر بولا۔ "وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

"وہ غریب ہے اور میرا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو تم اپنا خرچ کم کر دو!"

"یہ ناممکن ہے۔" وہ لڑکی فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میری سب سہیلیوں نے بڑے بڑے لوگوں سے شادیاں کی ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کروں گی۔ میں نئی دلی میں ایک بہت بڑی ملازمت پر کام کرتی ہوں میں ایک غریب آدمی سے شادی کیوں کروں؟"

"آئی سی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا تم ایسا کرو کہ یہ بچہ جو تم دونوں کی محبت کا ثمر ہے اس کے باپ کو دے دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُسے تمہارے پیار کی آخری نشانی سمجھ کر نہیں لوٹائے گا۔"

"میں اسے یہ بچہ نہیں دے سکتی!"

"کیوں؟"

"کیوں کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے جس سے مجھے محبت ہے!"

"جس سے تمہیں محبت ہے یہ اُس کا بچہ نہیں ہے!" میں حیرت

سے بولا۔

"تو پھر کس کا بچہ ہے؟"

"یہ میرے دوست کا بچہ ہے۔"

"تو یہ بچہ تمہارا نہیں ہے؟"

"یہ بچہ تو میرا ہے لیکن اس سے نہیں ہے جس سے مجھے محبت ہے۔ اس بچے کا باپ دراصل ایک بزنس مین ہے۔ جو میرا دوست ہے!"

"تو تم اس بزنس مین ہی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ تمہارا خرچ بھی یقیناً برداشت کر لے گا۔ اور اس غریب بچے کو اس کا باپ بھی مل جائے گا۔"

"نہیں میں اس بزنس مین سے بھی شادی نہیں کر سکتی۔" وہ لڑکی انتہائی سکون اور متانت سے بولی۔ "وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"جو تمہیں پسند ہے اس کا یہ بچہ نہیں ہے اور جس کا بچہ ہے وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو تم شادی کرو گی تو کس سے کرو گی؟ تمہارا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔"

"خوبصورت لڑکیوں کے مسئلے بہت جلد حل ہو جاتے ہیں مسٹر!" وہ ہنسی اور اس کے خوبصورت دانت چند لمحوں کے لیے اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک لبوں میں چمک چمک گئے۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی مگر اس کی خوبصورتی نرم گرم امنگ انگیز چیزوں کی یاد نہیں دلاتی تھی۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر سخت اور چمکیلی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ جیسے بلور، سونا موتی، خوبصورت لیکن سخت!

اس نے میرا بازو تھپک کے کہا۔

"میرے لیے چنتا نہ کرو۔ مجھے ضرور میرے مطلب کا شوہر مل جائے گا۔ ایسا جو میرے غریب عاشق کی طرح خوب صورت ہو۔ میرے دوست

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بزنس مین کی طرح مالدار ہو۔ اور میری پسند کا بھی ہو۔" اس نے گاڑی کا پٹ کھولتے ہوئے کہا:

"اب تم اپنا مال سنبھالو اور گاڑی سے نیچے اُتر جاؤ۔ جلدی کرو۔"

میں جم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اگر ایسا ہے تو تم اِس گاڑی سے نیچے اتر جاؤ!"

"میں کیوں اتر جاؤں؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"اس لیے کہ تم اگر اپنی پسند کی خاطر اپنے بچے کو قربان کر سکتی ہو تو اسی پسند کے لیے تمہیں اس گاڑی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ کیوں کہ یہ گاڑی مجھے پسند ہے۔ یہ گاڑی مجھے لکھ دو، ورنہ چلو تھانے۔"

"مسٹر!" وہ لڑکی ایک دم چیخ کر بولی اور اس نے زور سے میری کلائی پکڑ لی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے ناخن زور سے میری کلائی میں گاڑ دیے اور کہا:

"مسٹر میں تمہیں سب کچھ دے سکتی ہوں۔ مگر یہ گاڑی نہیں دے سکتی اسی گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے۔ میری سب سہیلیوں کے پاس گاڑیاں ہیں۔ سب ہی اپنی اپنی گاڑیوں پر اٹھلا کر چڑھتی تھیں۔ اور بات بات میں اپنی گاڑی کا رعب جتلاتی تھیں۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ان میں سے دو نے اپنی گاڑیاں بالکل اسی طرح حاصل کی تھیں جس طرح میں نے یہ گاڑی حاصل کی ہے۔ سرہا ؤ کُڈ آ ئی ٹالریٹ اٹ ISOHON COULD ITOLERATEIT میں نے بھی اس بزنس میں سے دوستی کر لی۔ جو دو سال سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں یہ گاڑی تمہیں دے دوں؟ آر یو نٹس؟ ARBYONUTS؟"

وہ لڑکی واقعی مجھ سے بہت خفا تھی۔ اس کا صبیح چہرہ اِک دم سرخ

ہو گیا تھا۔ اور وہ میری طرف ایسی شدید نفرت سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے اُس سے اس کی کار نہیں، اس کی عصمت طلب کی ہو۔ وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی۔

میں چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا غصہ سرد ہو گیا تو اس نے اپنے ناخن میری زخمی کلائی سے باہر نکال لیے۔ اپنی پلکیں اپنے رخساروں پہ گرا لیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی:

یہ گاڑی تو میں نہیں دے سکتی۔ اور جو تم چاہو۔ . . ."

"اب تو میں صرف یہ چاہتا ہوں"۔ میں نے جھنجھلا کر اُس سے کہا کہ کوئی ایسی ترکیب ہو جائے جس سے تمہاری ایسی مائیں بچے نہ جنا کریں۔

اگر ایسا ہو جائے تو اس دنیا سے حرامی بچوں کی پیدائش کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو جائے گا!

یہ کہہ کر میں نیچے اترا، اس کی گاڑی کا پٹ زور سے بند کر دیا اور جلدی جلدی وہاں سے چلا گیا۔

شام تک کوئی نہ آیا۔ پالنا خالی ہی رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھتا گیا دل کا سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ گلی کے سیاہ اور بھٹے ہوئے ہونٹوں میں بجلی کے دو چار میلے اور پیلے قمقمے مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جب نو کے قریب مجھے زور کی بھوک لگی تو میں نے واپس گھر چلنے کی ٹھانی اتنے میں میں نے دیکھا ایک میلے کچیلے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک منحنی سی عورت اس پالنے کے سامنے رکی۔ دیر تک رکی رہی۔ پھر اس نے جھک کر اپنے لبادے سے کچھ نکالا۔ اور اس پالنے میں رکھ دیا اور پھر دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے واپس ہونے لگی۔ سر جھکاتے ہوئے۔ میں اس کے تعاقب میں اُٹھ کر چلنے ہی والا تھا۔ کہ تاریک سایوں میں وہ عورت پلٹتی ہوئی دکھائی دی۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

واپس آکر اُس نے اپنے بچے کو اٹھایا۔ اپنے گلے سے لگایا اور واپس چل دی مگر گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ پلٹی۔ اس نے واپس آکر اپنے بچے کو پھر پالنے میں رکھ دیا اور گلی سے باہر بھاگ گئی۔

سنگھ پرادرز کے موٹر مرمت کرنے والے گیراج کے عقب سے جو راستہ لال قلعہ کو جاتا ہے، اُدھر جاتے ہوئے میں نے پیچھے سے اس کا لبادہ کھینچ لیا۔ یکایک میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ جسے میں نے عورت سمجھا تھا وہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد ہے اس کے چہرے پر کئی دن کی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا:

"تم کس کا بچہ اُس پالنے میں چھوڑ آئے ہو؟"

چند لمحوں تک وہ میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ میرے پاؤں پر گر گیا اور گڑ گڑا کر کہنے لگا:

"مجھے معاف کر دو۔ حوالدار صاحب!"

اس نے مجھے سی، آئی، ڈی کا کوئی آفیسر سمجھا ہوگا۔ وہ گڑ گڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ میں نے بھی اُس کی غلط فہمی کو دور کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"کس کا بچہ ہے وہ؟" میں نے اس سے پھر سختی سے پوچھا" جلدی بتاؤ؟"

"میرا بچہ ہے؟"

"کیا حرام کا بچہ ہے؟"

"نہیں مائی باپ! میری بیوی کا بچہ ہے!"

"تیری بیوی کا بچہ ہے تو پھر تو اسے اُس پالنے میں کیوں رکھ آیا؟ تیری بیوی کیسی ماں ہے؟ اُس نے تجھے اِس بات کی اجازت دے دی؟"

میری بیوی مر چکی ہے حضور! دس دن ہوئے وہ ایک ماہ کا بچہ چھوڑ کر مر گئی۔ گھر میں جو تھا اس کے کفن دفن پر لگ گیا۔ میں چھ ماہ سے بے کار

ہوں۔ کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ گھر میں پانچ بچے ہیں۔ یہ چھٹا ایک مہینے کی ننھی سی جان کل سے بھوک سے بلک رہا تھا۔ تین دن سے گھر کے سب لوگ فاقے سے ہیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کے لیے دودھ ہم لاتے رہے کل رات سے اس کے لیے دو گھونٹ دودھ بھی نہیں ملا کیسی دنیا ہے۔ یہ مالک؟ یہاں ننھے بچے کے لیے دودھ بھی نہیں ہے۔ تین دن سے میرے سب بچے میرے ساتھ فاقے کر رہے ہیں۔ وہ مر جائیں گے۔ میں جانتا ہوں وہ مر جائیں گے۔ میں بھی مر جاؤں گا۔ میں نے سوچا یتیم خانے کے لوگ اس کی پرورش کر سکیں گے، اس لیے ننھی سی جان کو وہاں ڈال آیا ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے وہاں وہ کیسے رہے گا۔ باپ ہوتے ہوئے بھی ساری زندگی بے باپ کا بیٹا کہلائے گا۔"

"مگر زندہ تو رہے گا۔ حوالدار جی۔ زندہ تو رہے گا۔" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

آدھی رات ——

پالنا خالی ہے

انسان کی بھوک کی طرح —— !!

میں بہت تھک گیا ہوں اور میں نے جو کچھ آج دیکھا ہے وہ دیکھ کر واپس گھر بھی نہیں جانا چاہتا۔ میں تھک کر اور گر کر اسی پالنے میں سو جانا چاہتا ہوں۔

مگر یہ پالنا بہت چھوٹا ہے —— اور ہمارے گناہ بہت بڑے ہیں۔!

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

یرقان

"یرقان بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں" یہ بھی ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے۔ سائنسدان کے اس مفروضہ کی طرح کہ چاند بذاتِ خود روشن نہیں دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے ڈاکٹر اور سائنسدان عامیوں سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ ورنہ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی چاندنی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کر سکے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری بات پر مطلق یقین نہ کیا جائے اور اسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاقِ نسیاں پر دھر دیا جائے۔

بہر حال آپ کو یاد کر لینا چاہیے کہ یرقان ایک بیماری ہے اور بہت اذیت پسند بصورتِ دیگر آپ کو اس کہانی کے پڑھنے سننے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کہانی کے شروع ہونے پر میں یرقان میں مبتلا تھا۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اسی طرح یرقان میں آدمی کو ہر طرف زردی ہی زردی نظر آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی غیبی ہاتھ نے کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہو اور بس۔ اس کے بعد مرض کا ایک اور درجہ ہے، زندگی کی ایک منزل ہے جہاں سب دوئی مٹ جاتی ہے اور مجھ ایسا شریف کنوارا نروان حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی بیماری اس مختصر سے قصہ کی ابتدا تھی، ان دنوں بیمار پڑا تو شاما میری عیادت کو آتی۔ شاما کے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ

میری محبوبہ ہے۔ یعنی میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے جو چکوال میں اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے بیس روپے تنخواہ پاتا ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملوک شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں، شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے اس وقت اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ بچاری ان پڑھ ہے نا۔ اور جب میں سیف الملوک ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کس قدر گھبرا جاتی ہے۔ لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گلِ عارض پر چمک اور آنکھوں میں رمک آ جاتی ہے لب کانپتے ہیں اور

پھر مجھے یکایک اس کی دھیمی شیریں آواز سنائی دیتی ہے: "آگے کیوں نہیں پڑھتے؟" اور ... میں بھلا خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا، محبت؟ نہیں یرقانیت! یا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان؟

ایک دن ..... وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے ..... میں بستر پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ہمارے پڑوسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے، وہ ان کے کوئے بیچتا تھا، بڑی اچھی تجارت ہے، پچھلے سال اس نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں کوئے بیچ کر تین سو روپے کمائے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے آٹھ دس ریشم کے کوئے مانگ لایا تھا۔ ان کویوں میں سے پانچ پھوٹ گئے تھے اور ان میں سے ریشم کے کیڑے نکل آئے تھے، سفید اور زردی مائل کیڑے جو کویوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، صرف سات دن زندہ رہتے ہیں، اس عرصے میں نر و مادہ آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد نر مر جاتا ہے۔ پھر مادہ انڈے دیتی ہے، زرد، باریک اور گول گول، خشخاش کے دانوں جیسے، اس کے بعد مادہ بھی مر جاتی ہے۔ بس یہی سات دن ان کی حیاتِ معاشقہ ہیں۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ان میں چار نر تھے اور ایک
مادہ بڑے بڑے زرد پروں والی جو خاموش بیٹھی نر کیڑوں کی طرف دزدیدہ
نگاہوں سے تک رہی تھی، وہ کسے پسند کرے گی۔ کس پر اس کی نظر انتخاب
پڑے گی۔ وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس سیمیں تن حسینہ کا محبوب ہوگا۔
آپ سچ جانیے مقابلہ واقعی سخت تھا، نر کیڑے دیوانہ وار بھونروں کی
طرح اس کی طرف اڑ اڑ کر چلے جاتے تھے۔ وہ پروانوں کی طرح شمع کے
گرد طواف کرتے تھے، کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے، اس طرح کہ مجھے ان میں
سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا پھر میں جلدی سے انہیں الگ الگ کر دیتا
وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے، بالکل خاموش بے حس و حرکت مگر جلد ہی وہ حسین
مجسمہ انہیں اپنی طرف مائل کر لیتا اور وہ پھر بے اختیار پھڑپھڑانے لگتے، کبھی
ایک کبھی دوسرا اڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منہ کو اس کے منہ کے
قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کا اظہار کرتا، وہ کافر ادا کبھی
مسکراتی، کبھی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر پرے ہو جاتی۔ نر بیچارا اپنا سا منہ
لے کر رہ جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عورت کی فطرت میں دو رنگی کیوں ہے، ایک ہی
نظر سے یہ گھاؤ بھی پیدا کرتی ہے اور اس پر پھاہا بھی رکھ دیتی ہے دل تڑپا
دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے۔ ستم بھی اس کو جچتا ہے کرم بھی اسے شایان
ہے ۔ ۔ ۔ ۔

یہی سوچتے سوچتے میں نے آنکھیں بند کر لیں، کسی کے پاؤں کی ہلکی سی
چاپ سنائی دی اور کوئی میرے سرہانے آ کھڑا ہوا۔

میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہا: "ماں ۔ ۔ ۔ دلیہ لائی ہو؟"

"نہیں، میں ہوں شاما۔"

اگر میرے پیٹ پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل یکلخت پھٹ جاتی تو بھی
مجھے اس قدر تعجب نہ ہوتا جس قدر شاما کے آنے پر ہوا، جب سے میں بیمار

ہوا تھا اور مجھے بیمار پڑے تین ماہ ہو چکے تھے۔ وہ ایک دفعہ بھول کر بھی مجھے
پوچھنے نہ آئی تھی، کیا اس کے خاوند کا چکوال سے کوئی خط نہ آیا تھا؟

"شاما، تم؟" میں نے خالص ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ہاں میں!" اس نے خالص دیہاتی انداز میں جواب دیا، "یہ لو! تمہارے
لیے چند ایک خوبانیاں لائی ہوں، خوب پکی ہیں اور میٹھی۔" یہ کہہ کر اس نے
رومال کھول کر سب خوبانیاں میرے بستر پر بکھیر دیں۔

یرقان میں مجھے دو چیزیں بہت مرغوب و موافق ہیں، ایک خوبانی
دوسری شاما، پھر جب دونوں اکٹھی مل جائیں تو میری خوش قسمتی کے کیا کہنے
آج میں واقعی خوش قسمت تھا۔ میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا، اور اخبار کا
وہ صفحہ جس پر ریشم کے کیڑے دھرے تھے آہستہ سے پرے رکھ کر کہا "آؤ بیٹھو۔"

وہ پائنتی پر بیٹھ کر بولی "کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے۔"

کچھ دیر ہم دونوں صم بکم بیٹھے رہے۔ میں نہ جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے
دل میں جذبات کا طوفان امڈ آیا تھا، اپنے غم اور غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا
مگر یکایک زبان گنگ ہو گئی، دل میں شکایتوں کا طومار تھا، مگر لب جیسے کسی
نے سی دیے تھے، دل میں بے چینی کا طوفان تھا مگر آنکھیں اس کے چہرے
کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے کہا: "چکوال
سے کوئی خط آیا؟"

"نہیں تو، تم تو بہت ہی نحیف ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں اس قدر
زرد کیوں ہیں، مجھے از حد افسوس ہے میں اس سے پہلے تمہارے ہاں نہ آ سکی
ماں کی طبیعت علیل تھی، خوبانی کیوں نہیں کھاتے، کھاؤ۔"

میں نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا، ایک خوبانی اٹھائی اور منہ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں ڈال کر دل کو لعنت ملامت کرنے لگا، ارے میاں کچھ تو کہو، اگر شکایت کی جرأت نہیں تو اظہارِ محبت ہی سہی، ان تعریفی نگاہوں سے کیا ہوتا ہے کھل کر بات کرنا سیکھو، گونگے عاشق کو تو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔

"شاما، تم ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا، یہ ریشم کے کیڑے ہیں؟" شاما نے جلدی سے اخبار کو اپنی طرف سرکا کر کہا: "کس قدر خوبصورت ہیں، تم نے کہاں سے پائے؟ اچھا یہ مادہ ہے یہ نر ہیں، کیا خوب اور اب اس نر مادہ کا آپس میں ایجاب قبول ہو گیا، دیکھو تو یہ کیڑا بڑا انسان ہے نا، پتہ نہیں اس سے کیا کیا میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے بھی مرد ایسے ہوتے ہیں نا یہ جوڑا تو الگ ہوا۔

"اب یہ باقی تین کہاں جائیں گے بچارے کس طرح سسک رہے ہیں دیکھو۔"

میں نے شاما کی طرف دیکھا، سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی لب تھوڑے سے کھلے تھے اور طلائی احمر کی طرح دمک رہے تھے۔

"تم کس قدر خوبصورت ہو شاما" میں نے سینمائی انداز میں کہا: "اس سے بھی زیادہ خوبصورت جتنا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہو، میری آنکھوں اور تمہارے حسن کے درمیان ایک نیند پردہ حائل ہے، مگر پھر بھی تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو۔ اور یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے تو پھر کیا یہ تابناک حسن میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے گا ۔ ۔ ۔ ۔ اور تمہاری آنکھیں کس قدر روشن ہیں۔ صاف اور پاکیزہ، نیلوفر کی طرح کھلی ہوئیں۔"

ماں دلیے کر اندر آئیں، کہنے لگیں: "بیٹا نیلوفر کی بابت کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں اماں! یہی ۔ ۔ ۔ ۔ یہی ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ سنا ہے کہ نیلوفر یرقان میں بہت مفید ہے۔"

"نہیں بیٹا، مجھے دیسی دوائیوں پر یقین نہیں اور بعض حکیم تو ۔ ۔ ۔ ۔"

اماں شاما سے باتیں کرنے لگیں۔ میں چپ چاپ دلیہ کھانے لگا۔

"ہاں میں ابھی ابھی ان سے یہ ذکر کر رہی تھی۔" شاما نے سر جھکا کر کہا "پتہ نہیں انہیں موافق آئے نہ آئے۔"

شاما بہت حسین تھی۔ اس لیے چاہنے والے بھی بہت تھے، وہ بیاہی ہوئی تھی اور یہاں میکے آئی ہوئی تھی، عاشقوں کے وافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کی والدہ اس رنڈاپے میں بھی سہاگ کی شان اور جوانی کی آب قائم رکھے ہوئے تھی، اس امر نے بھی شاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا اور ان تمام امور کا شاما کو بخوبی احساس تھا اس کے شریف اور باعصمت ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے، اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم ڈاکٹر اور وید [illegible] کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دکان ہے ملائی کی ایک [illegible] [illegible] ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ایک نوجوان ہے۔ [illegible] چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں، ایک بچارہ ہے سیدھا سادا آدمی وہ قمیص کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف ٹیلرنگ شاپ میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت ہو، ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل سکول ہے، پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ مڈل کلاسیں اس سال کھلی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نو وارد ہیں

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

خوبصورت، خوش طبع جوان ہیں، سکول کو لے کالج کا بدلہ بنانا چاہتے ہیں گاتے خوب ہیں، سُر ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا کوئی گراموفون بج رہا ہے پیارو قوال کا من تو شدم تو من شدی انہیں بہت مرغوب ہے۔ شاما کے گھر سے گزرتے ہوئے انہیں اکثر گنگناتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سنا گیا ہے شاما بھی کبھی دریچے میں بیٹھ کر سن لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر اُس وقت ایک عجیب مُسکراہٹ ہوتی ہے۔ جوش رقابت میں لیکن اسے محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام ہے وہ مجسٹریٹ بھی ہیں اور طبیب بھی، ان کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا بڑا بنیادی سبب یہی ہے۔ موسیقی اچھی خاصی جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں، شاما کو خالص فنی نکتہ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں اور اسی پرانے انداز سے تنقید کرتے ہیں، گویا، شاما، شاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ ڈگیس کا ایک مرمریں مجسمہ ہے یا باطی سیلی کی پرکیف تصویر۔

ہمارے قصبہ میں باوا تھمن گر کا استھان بہت مشہور ہے۔ عقیدت مند روحیں جو اکثر طبقۂ اناث سے تعلق رکھتی ہیں انہیں صرف "باوا جی" کہہ کر پکارتی ہیں، باوا جی کی جوانی ڈھل چکی ہے مگر ہر بات میں نوجوانوں سے آگے قدم دھرتے ہیں" فنا ہونے سے پہلے کھیلتی ہے موج پانی پر" چرس کا دم لگاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور شاما سے افلاطونی محبت رکھتے ہیں، قد لانبا، جسم اکہرا، اور رنگ بگلے کی طرح سپید ہے۔

ساون!

ساون برسات کا مہینہ ہے، ساون میں جھولے پڑتے ہیں، شاعر اور ندی نالے طغیانی پر آجاتے ہیں، دل میں امنگیں اٹھتی ہیں، شاید خون کچا ہوتا ہے، جوش مارتا ہے، میں نے کبھی اپنی کوٹھڑی چھوڑ دی اور باہر باغ میں آ رہا

سول کے ایک گھنے چھتنارے کے نیچے میرا بستر تھا اور اس کے نزدیک ہی ایک چنار پر میری چھوٹی بہن نے جھولا ڈلوایا تھا قصبہ بھر کی لڑکیاں دوشیزائیں اور نوبیاہی بہوئیں ہمارے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں، بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ جب شاما پینگ بڑھاتی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا اور جب وہ پینگ بڑھاتے بڑھاتے دور اوپر چنار کی ٹہنیوں کے سبز سبز پتوں میں ایک لمحہ کے لیے گم ہو جاتی تو میرا دل اچک کر گلے میں آ رہتا کہیں وہ گر نہ پڑے۔

ایک دن جب شاما جھولا جھول رہی تھی اور میرا نوکر رالی میرے پاؤں داب رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا، رالی، اگر وہ گر پڑے تو پھر کیا ہو؟"

رالی بولا "کون بابو جی؟"

"شاما"

رالی بیچارا حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا، اسے میری بات سمجھ میں نہ آئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔

رالی بیچارا سیدھا سادا نوکر ہے، کبھی کبھی ہکلا کر بات کرتا ہے باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہے کیونکہ اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور بڑے بھائی کے اور ماں باپ کے لاڈ اور چاؤ نے عالم شباب ہی میں اس کے بال کھچڑی کر دیئے ہیں۔

"رالی" میں نے اسے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا "تم میری بات نہیں سمجھے۔"

اتنے میں شاما کی ماں دوڑتی ہوئی آئی، کہنے لگی، بابو جی، ذرا رالی کو اجازت دینا، پن چکی سے آٹا پسا کر لے آئے، بڑی مہربانی ہو گی (آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر) آج ضرور بارش ہو گی اور اگر رالی ابھی ابھی آٹا نہ لے آیا تو پھر ندی نالوں پر ہو جائے گی، دیکھئے بادل پہاڑوں پر کیسے چھاتے ہوتے ہیں۔

رالی بولا "میں ابھی جاتا ہوں۔"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں نے کہا: "میری طرف سے اجازت ہے۔" رالی یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

رالی بےچارہ بہت سیدھا سادا ہے۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی چاروں طرف بادل چھا رہے تھے اور مشرق کی طرف تو کالا دھاری کی چوٹیاں کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا آج ندی میں خوب طغیانی آئے گی۔ پہاڑی نالہ کمزور آدمی کے غصے کی طرح ہے جلد چڑھتا ہے اور جلد ہی اتر جاتا ہے، ساون کے دنوں میں ندی کئی جانیں لے لیتی ہے نالہ ایک دم ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے اور کناروں سے اچھل کر میلوں اطراف میں پھیل جاتا ہے، گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں ڈھور ڈنگر اور اناج اور مال کے نقصان کا کچھ اندازہ نہیں۔

اماں میرے قریب آ کر کہنے لگیں: "اندر چلو، آج بارش ہوگی، گھٹا تلی کھڑی ہے رالی کہاں ہے؟"

"شاما کی ماں نے پن چکی سے آٹا لانے کو کہا تھا، ادھر ہی گیا ہوگا، چلو اندر چلتا ہوں۔" لڑکیوں کے جھولا جھولتے بارش شروع ہو گئی۔ پل میں جل تھل ہو گیا، ندی کی پر شور روانی میرے خواب کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دس بج گئے۔ رالی نہ آیا۔ اماں اسی فکر میں کھوئی ہوئی میرے پاس بیٹھی رہیں: "کم بخت کو اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی، انکار کر دیتا۔" اماں نے کہا۔

"میں نے ہی اجازت دے دی تھی۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم بھی نادان ہو، وہ بھلا موسلا دھار بارش میں کیسے آئے گا۔ ذرا ندی کا شور تو سنو۔ ندی ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور وہ اس وقت تک کیوں نہیں آیا، پن چکی بھی تو دور نہیں ہے۔ یہی چار میل کے قریب ہوگی۔ اسے اسی

وقت تک آجانا چاہئے تھا۔ کہیں اس پار ہی نہ رہ گیا ہو۔"

"اور اماں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا: "اگر اس نے ندی کو عبور کرنے کی کوشش کی ہو، یوں تو اچھا خاصا تیراک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"چپ بیٹا، یوں نہیں کہا کرتے، رام سب کا بھلا کرتے ہیں۔"

بارہ بج گئے مگر مجھے نیند نہ آئی، شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو میں میں نے دیکھا کہ اماں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں۔ اتنے میں آنگن میں آہٹ سی ہوئی کسی نے دیوار کے ساتھ اپنا سونٹا ٹیک دیا اور لمبی سانس لی۔

میں نے کہا: "رالی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آٹا لے آئے؟"

"لے آیا بابوجی، وہاں ان کے گھر تو سب سوئے پڑے تھے دوھوا کو جگایا اور اس کے حوالے کر کے ابھی آ رہا ہوں۔"

"کمبخت میں پوچھتا ہوں تم آٹا کیسے لے آئے؟"

"کمبال میں بابوجی، بالکل نہیں بھیگنے دیا۔ ندی بڑے زوروں پر تھی پر ایشور نے ہی جان سلامت رکھی۔"

"بیوقوف تمہیں آنے کی اتنی کیا جلدی تھی۔ ندی کے پار ہی رہ جاتے۔"

"میں نے سوچا شاما بھوکی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جواب سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ جنگل کے پودے ہیں انگور کے خوشے کیسے۔ تلخ لہجے میں میں نے اس سے پوچھا "اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو ۔ ۔ ۔"

رالی تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر ہکلانے لگا: "میرا ۔ ۔ ۔ کیا ہے بابوجی یہ زندگی کس ۔ ۔ ۔ کس ۔ ۔ ۔ کسی کے کام آجاتی۔ میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا۔"

"کمبخت، مجنوں بھی کوئی تمہاری ہی طرح کا گنوار ہوگا۔"

"کیا کہا بابوجی؟"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"کچھ نہیں جاؤ سو رہو۔"

اب شمع زرد پڑ چکی تھی۔ ماحول بالکل ساکن، صرف ایک پروانہ اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پروانہ۔۔۔ شمع۔۔۔۔ رالی۔۔۔ پروانہ۔۔۔۔ رالی۔۔۔۔ شمع۔۔۔۔

رالی۔۔۔ شاما۔۔۔۔ شمع۔۔۔

باواجی گرکا استھان، ندی کے کنارے شمشان بھومی کے قریب واقع ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اور ایک مختصر سا باغیچہ اور اس کے ساتھ کپڑے دھونے کا گھاٹ۔ باواجی اور اُن کا چیلا سوسنا تو وہیں دیوی کے قدموں میں آسن جماتے ہیں اور رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتے ہیں۔ ندی میں ہر سال طغیانی آتی ہے مگر مندر ہمیشہ محفوظ و مامون رہتا ہے۔ پچھلے سال تو گھاٹ بھی بہہ گیا تھا، مگر مندر جوں کا توں کھڑا رہا۔ یہ سب باواجی کی دعا کا اثر ہے اور اُن کے فوق الفطرت ہونے کا ثبوت۔ شاما کی ماں دودھ والا باواجی کو ہر روز بہ قائم کرنے جاتی ہے اور شاما بھی کبھی کبھار اس کے ساتھ چلا جایا کرتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اسے باواجی کے باغیچے میں ہی دیکھا تھا۔ اُس نے جوہی کے پھولوں کا ایک گچھا اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اور وہ پیڑ میں پھول چن چن کر رکھ رہی تھی آہ جوہی کے پھول۔

کتنی مدت ہو گئی اُس اولین ملاقات کو، مگر آج پھر وہ پہلی نگاہیں اور جوہی کے پھول مجھے رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ ہم گھڑی کی سوئیوں کو اُلٹ پلٹ کر سکتے ہیں۔ مگر زمانے کی سوئی کو اُلٹا پھیر دینے کی کس میں ہمت ہے۔ کاش وہ پہلی نگاہیں مجھے واپس مل جائیں۔ کاش میں انہیں پھر اک بار دیکھ لیتا۔ وہ نگاہیں جنہوں نے میرے سینے میں امنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا جنہوں نے محبت کی سوئی ندی کو اپنے نازک پتواروں سے متلاطم کر دیا تھا مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے۔ شفق کی طرح رنگین قوسِ قزح کی طرح دُور۔۔۔۔

رالی میرے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے اُسے آہستہ سے کہا۔ "رالی مندر سے جوہی کے پھول لاؤ گے؟"

رالی بولا۔ "بابوجی بارش ہو رہی" پھر یہ کہہ کر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا جاتا ہوں۔"

رالی اُسی موسلا دھار بارش میں اٹھ کر چلا گیا۔ آج اُس کی نگاہ اولین کی یاد نے دل کی دبی ہوئی امنگوں میں ایک ہیجانی کیفیت سی پیدا کر دی تھی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی خیالی دنیا میں گم ہو گیا۔ اس دنیا کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس خیال سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ دنیا میری ہے اور اس جسدِ خاکی کے آخری سانس، زندگی کے آخری لمحہ اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ دنیا میری ہو گی۔ شاید یہ دنیا ہی میرا سرمایہ حیات ہے اس دنیا میں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ایک ناؤ بن گیا ہوں۔ ایک ناؤ جو چاروں طرف لہروں سے گھری ہوئی ہے۔ لہریں کھیلتی ہیں، مسکراتی ہیں ڈوبتے ہوئے سورج کی ارغوانی کرنوں کو جھک جھک کر پیار کرتی ہیں یکایک میں اپنے بادبان پھیلا دیتا ہوں اور لہریں اپنے شانوں پر لیے ہوئے مجھے دُور دُور بہا لے جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کس طرف؟ نجانے کیوں؟ مجھے صرف اک خاموش موسیقی اور اک جانفزا سرود کا احساس ہوتا ہے کیف آور اور شیریں۔

پتہ نہیں میں کتنا عرصہ اسی خیالی دنیا میں گم رہا یکتا عرصہ اور اسی خیالی دنیا میں گم رہتا۔ اگر اماں میرا شانہ جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتیں۔ "بیٹا، اٹھو تو سہی، وہ دیکھو رالی۔۔۔۔"

میں نے آہستہ سے کہا "کیا بات ہے۔ رالی، رالی پھول لے آیا؟"

"اچھا تو کیا تم نے اُسے مندر بھیج دیا تھا؟" اماں نے کہا "آہ بیچارا رالی اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے اور اس کے سر پہ کئی چوٹیں آئی ہیں، برآمدے میں پڑا ہے۔"

میں جلدی سے اٹھ کر برآمدے میں گیا۔ رالی آنکھیں بند کیے چارپائی پر

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بڑا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سر پر اور دائیں بازو پر پٹیاں بندھی تھیں۔ میں نے پوچھا "بےوقوف کیا مندر میں باواجی سے لڑ پڑے؟ اگر وہ پھول نہ دیتے تھے تو وہیں چلے آتے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہو سکتا تھا بھی پیٹا ہو گا تمہیں، جیسا گورو ویسا چیلا۔"

"وہ مندر کہاں رہا بیٹا، جو تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی اس کمبخت جھڑی کو کچھ ایک ہی ٹلنا تھا۔ آج ندی میں اس قدر طغیانی ہے کہ توبہ ہی بھلی، ذرا شور تو سنو۔ اور جب رالی مندر کی طرف پھول لینے گیا تو مندر کے چاروں طرف پانی چڑھ رہا تھا اور گھاٹ بہہ رہا تھا۔"

"تو . . . میں نے تو اسے یوں ہی بھیج دیا تھا اگر پانی چڑھ رہا تھا تو نہ جاتا ایسی بھی . . ." میں نے فقرہ نا تمام چھوڑ دیا۔

"کیسے نہ جاتا بیٹا، وہاں شاما . . .؟"

"کیا کہا، شاما؟"

اماں میری [illegible] اور یہ دیکھو باوا اور اس کا چیلا . . . دو کوس کیسے لپک کے نکلے۔ ان کو شاما کا بھی نہ خیال آیا مگر

"مگر شاما گیا کیا؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"کہہ تو رہی ہوں بیٹا" اماں جلدی سے بولیں "کہ شاما بھی وہاں گئی ہوئی تھی اور دیوی جی کو پوجا تمام کر کے باغیچہ میں جوہی کے پھول چن رہی تھی کہ بارش نے آ گھیرا، وہیں مندر میں ٹھہر گئی۔ سوچا ہو گا کہ بارش تھمے تو جاؤں آن کی آن میں جل تھل ہو گیا مندر کے چاروں طرف پانی لہریں مارنے لگا اور جب نیا گھاٹ بھی بہنے لگا اور ندی کا رخ مندر کی طرف مڑا تو باواجی ڈر گئے، چیلے سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"اور شاما کو وہیں چھوڑ دیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو، جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے، جب رالی وہاں پہنچا تو پانی نے مندر کو چاروں طرف اچھی طرح سے گھیر لیا تھا، شاما سیڑھیوں

پر کھڑی چیخیں مار رہی تھی اور باواجی اور اُن کا چیلا تیرتے ہوئے خشکی کی طرف آ رہے تھے۔"

"کمینے!" میں نے تیز تر لہجے میں کہا۔

اتنے میں کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اماں اندر چلی گئیں، نائب تحصیلدار صاحب تھے برآمدے میں آ کر رالی کے سرہانے بیٹھ گئے کہنے لگے:

"آپ کے نوکر نے آج بڑی جوانمردی دکھائی۔ مندر کی گرتی ہوئی دیواروں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچا کر لے آیا۔ چوٹیں تو بہت لگی ہیں بیچارے کو۔ میں نے ڈاکٹر سے وہیں پٹی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا آج شام کو ڈاکٹر پھر آئے گا . . . . رالی بیٹا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

اتنا کہہ کر تحصیلدار صاحب چپ ہو گئے اور رالی کی طرف دیکھنے لگے رالی خاموش لیٹا ہوا تھا میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

"کیوں روتے ہو رالی؟" میں نے پوچھا۔

رالی نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا "بابوجی سر میں بہت درد ہے۔"

تحصیلدار صاحب چارپائی سے اٹھ کر بولے "اچھا تو میں چلتا ہوں اور ڈاکٹر ابھی آپ کے ہاں بھیجتا ہوں۔ چوٹیں تو معمولی ہیں۔ میرے خیال میں، ایک دو دن میں اچھا ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔ شاما کا خاوند سنا ہے کل یہاں پہنچے گا۔"

وہ چلے گئے، میں چپ چاپ رالی کے پاس بیٹھا رہا "شاما کا خاوند کل یہاں پہنچے گا . . . کل . . . فکر نہ کریں . . . چوٹیں معمولی ہیں . . . چوٹ . . . کاش تحصیلدار صاحب کو پتہ ہوتا کہ یہ چوٹیں معمولی نہیں ہوا کرتیں . . .

اماں رالی کے لیے گرم دودھ لے آئیں، میں چمچے سے اسے پلانے لگا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس واقعے کے پانچ روز بعد شاما اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

جانے سے قبل وہ مجھے ملنے کے لیے آئی۔

"میں آج جا رہی ہوں بھیا!"

اس کا چہرہ زرد تھا اور لب اناری کلی کی طرح سرخ تھے۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھا اور وہ [illegible] ماں نے مجھے بہلا کر اسے دعا دی "پرمیشر تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے۔"

"رالی کدھر ہے بھیا، میں اُسے ملے بغیر نہ جاؤں گی۔"

ماں نے جواب دیا "رالی چشمے سے پانی بھرنے گیا ہے۔ ابھی آتا ہی ہوگا۔"

گھنٹہ پون گھنٹہ گزر گیا۔ مگر رالی نہ آیا۔

میں نے نہایت نرم لہجے میں آہستہ سے کہا "شاید وہ نہ آئے گا شاما!"

جیسے اُس نے میری بات سمجھ لی ہو، وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ آہستہ سے بولی "تم اچھے ہو جاؤ گے بھیا" پھر اس نے سر جھکا کر ماں کو پرنام کیا۔

اور وہ چلی گئی۔ چپ چاپ خاموش سر جھکائے ہوئے مجرم کی طرح۔

کائنات کا ہر ذرہ بے مصرف ہے اور انسان کی ہر کوشش بے سود، یہ انسان کتنا حقیر ہے اور یہ دنیا اس سے بھی حقیر تر، یہ عقدہ لاینحل کیا ہے۔ اور کس لیے۔ اور پھر اگر تمام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے چکنا چور کر دیا جائے۔ اس طرح کہ اس کے ریزے ریزے ہو کر بکھر جائیں اور کوئی ان کی ہوا تک نہ پا سکے تو پھر... تو پھر کیا ہو... کس لیے؟... یہ کیسے دل میں ہزاروں خیال تھے۔

بے سود، سب بے سود۔

بہت دیر کے بعد رالی آیا، پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ہونٹ نیلے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر جب وہ میرے پاؤں دابنے بیٹھا تو میں نے اس سے پوچھا رالی آج کہاں غائب رہا۔

"ہاں مجھے دیر ہوگئی بابوجی۔ معاف کر دو" اس نے جواب میں کہا۔

تھوڑی دیر ہم دونوں خاموش رہے، پھر رالی بولا "اس دن آپ نے جوہی کے پھول [illegible] تھے آپ یہ گھبرائے سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے پھولوں کا ایک گچھا نکالا اور میرے ہاتھ دے دیا۔ باسی پھول اور پتیاں زرد، مگر [illegible] خوشبو تھی۔

مجھے تحصیلدار صاحب کی بات یاد آگئی۔ میں نے کہا "رالی! اسے تم رکھ لو [illegible] تمہیں اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں، بابوجی میں اسے نہیں لے سکتا۔"

"کیوں؟"

رالی [illegible] رہا

میں نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "رالی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے [illegible] شاعر مزاج ہو۔"

رالی چپ بیٹھا رہا بے جان، بے حس و حرکت، مٹی کی مورت۔ پھر سر جھکا کر آہستہ سے میرے پاؤں دابنے لگا۔ گرم آنسوؤں کے ایک دو قطرے میرے پاؤں پر گرے۔

زندگی کس قدر عجیب ہے۔

[illegible]... [illegible]... بابوجی ... رالی ... سوشا تم ...

[illegible] بکھرے ...

زندگی کس قدر عجیب ہے۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ٹوٹے ہوئے تارے

رات کی تھکن سے اُس کے شانے ابھی تک بوجھل تھے۔ آنکھیں خمار آلود اور لبوں پر ترمٹ کے ڈاک بنگلے کی بیر کا کسیلا ذائقہ، وہ بار بار اپنی زبان کی نوک ہونٹوں پر پھیر کر اس کے چھلکے اور بے لذت سے ذائقے کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو اس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں۔ لیکن پہاڑوں کے موڑ اُسے اس طرح یاد تھے جیسے الف ب کی پہلی سطر، اور وہ نہایت چابکدستی سے اپنی موٹر کو جس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے (ایک آدمی اور شاید ایک عورت) ان خطرناک موڑوں پر گھمائے لے جا رہا تھا۔ کہیں کہیں تو یہ موڑ بہت خطرناک ہو جاتے ایک طرف عمودی چٹانیں، دوسری طرف کھائی، جس کی تہ میں جہلم کے نیلے پانی اور سفید جھاگ کی ایک ٹیڑھی سی لکیر نظر آ جاتی، انہیں موڑوں پر سے تو کار کو تیز چلانے میں لطف حاصل ہوتا تھا۔ سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آ جاتی تھی۔ صبح کی ہوا بھی بڑی پیاری اور خوشگوار تھی۔ اس میں اونچی چوٹیوں کی گھاٹیوں پر پھیلے ہوئے جنگلوں کے جگین کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ کیسی انوکھی مہک تھی، عجیب بے نام سی، تر و تازہ، تہالو کے لبوں کی طرح، وہ اپنی نیم وا پلکوں کے سائے میں پچھلی رات کے بیتے ہوئے طرب ناک لمحوں کو واپس بلانے لگا.... بیر کی رنگت میں ڈوبتے ہوئے سورج کا سونا گھلا ہوا تھا..... اس کے کسیلے پن میں ایک عجیب سی لطافت تھی..... رات کی بھیگی ہوئی خاموشیوں میں دور کہیں ایک بلبل نغمہ ریز تھا..... بلبل نے اپنے نغمے میں خاموشی اور آواز

کو یوں ملا دیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے تھے..... اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ خاموشی کہاں ختم ہوتی ہے۔ اور یہ موسیقی کہاں شروع ہوتی ہے..... چاندنی رات میں سیب کے پھول ہنس رہے تھے اور تہالو کے لب مسکرا رہے تھے..... وہ لب جو بار بار چومے جانے پر بھی معصوم دکھائی دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز بھی انہیں نہیں چھو سکتی۔ کیسا عجیب احساس تھا اور اب تو وہ ڈاک بنگلہ بھی میلوں پیچھے رہ گیا تھا..... رات کی تنہائیوں میں تہالو کا حسن غیر فانی اور غیر زمینی معلوم ہوتا تھا..... اس کے لب اس کی آنکھوں کی نرمی، اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم، جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی اور پھر اُن بالوں میں سیب کے چند چٹکتے ہوئے غنچے، جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی میں بلبل کے میٹھے نغمے اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ خاموشی کہاں شروع ہوتی ہے اور یہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے..... لیکن اب تو وہ ڈاک بنگلہ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اس وقت کسی پرستانی قلعے کی سی معلوم ہو رہا تھا موڑ دار راستے کے الجھاؤ میں گھومتی ہوئی سڑک بابری تھی، اور اس کے تخیل میں تہالو کے لب اور جگین کی مہک اور بلبل کا نغمہ اور بیر کا سنہرا رنگ نیند کے تانے کی طرح چکتی ہوئی سڑک پر الجھتے گئے۔ نیچے جہلم کا پانی وحشی راگ گانے لگا، اور فضا میں سیب کے لاکھوں پھول آنکھیں کھول کر جھانکنے لگے اور اس نے سوچا کیوں نہ وہ اپنی موٹر کو اسی کھائی کے وسیع خلا پر ایک بے فکر پرندے کی طرح اڑا کر لے جائے، یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی نیم وا آنکھیں کھل گئیں۔

راستے میں ایک چشمے کے کنارے اس نے اپنی کار ٹھہرائی اور دیر تک ہاتھ پاؤں دھوتا رہا۔ آنکھوں کو چھینٹے دیتا رہا۔ ایک پہاڑی گیت گنگناتا رہا اور پانی سے کلیاں کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں رچا ہوا خمار دور ہو

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

گیا اور بتر کا کسیلا ذائقہ بھی جاتا رہا۔ اب لب سوکھ گئے تھے۔ آنکھوں میں جلن سی محسوس ہونے لگی پیاس اور اشتہا بھی۔ اُس نے بوتل کھول کر گرم گرم چائے انڈیل لی اور سرد توس پر مکھن لگا کر کھانے لگا۔ بدن میں گرمی اور قوت آ رہی تھی۔ شانوں کی تھکن معدوم ہونے لگی۔ اب وہ راہ چلتے ہوئے لوگوں، موٹروں اور لاریوں کو غور اور دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس وادی میں بیکانیر کے مارواڑی اپنی بھاری بھرکم بیویوں کو پہل گام سیر کرانے کے لیے جا رہے تھے۔ اس کار میں ایک یوروپین مرد ایک ہاتھ سے کار چلا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی بیوی کی کمر پر تھا۔ جو اپنے لبوں پہ سُرخی لگانے میں مصروف تھی۔ اس لاری میں بہاری کلرک اور ان کی ادھ موئی بیویاں بیٹھی تھیں۔ اور ان کے بے شمار بچے لاری کی کھڑکیوں پر کھڑے غل مچا رہے تھے۔۔۔ اس لاری میں سکھ ڈرائیور کی پگڑی ڈھیلی ہو چکی تھی اور وہ اونگھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ چند میل آگے جا کر یہ سکھ ڈرائیور راجی لاری کو کھائی کے وسیع خلا پہ اڑانے کی کوشش کرے گا اور پھر دوسرے دن وہ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھے گا "مری کشمیر روڈ پر ایک حادثہ لاری جہلم میں جا گری سب مسافر جہلم میں غرق ہو گئے، ڈرائیور بال بال بچ گیا۔۔۔"

لاری موڑ پر سے گزر گئی۔

اسی لاری میں بیٹھے ہوئے لوگ جن میں پنجاب کے چند پہلوان بھی شامل تھے بہت خوش و خرم دکھائی دیتے تھے اس خوشی میں غالباً کشمیر کی ناشپاتیوں اور عورتوں کی نرمی اور گداز پن کا بہت حصہ تھا۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ چند میل آگے جا کر انہیں موت سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی پہلوانی کا ثبوت دینا پڑے گا اور یہ کہ تھوڑی دیر ہی میں وہ عورتوں کی طرح چیخیں مارتے اور کھائی پر ناشپاتیوں کی طرح لڑھکتے دکھائی دیں گے۔۔۔ اس لاری میں چند کشمیری پنڈت سرسرا رہے تھے۔ لیکن کیتوں نے نقاب الٹ دیے تھے۔ ایک بدصورت عورت نے جو ایک نہایت خوبصورت برقعہ پہنے تھی۔ زور سے پان کی پیک سڑک پر پھینکی

اور چند چھینٹیں اڑ کر چشمے کے قریب آ پڑیں اور وہ پرے سرک گیا۔ تین ہانو، اپنے گھٹے ہوئے سروں پر تنگ ٹوپیاں پہنے اور کاندھوں پر نمک کے بڑے بڑے ڈلے اٹھائے گزر رہے تھے۔ ان کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور گال سرخ اور میلے پاؤں میں پیال کی چپلیں تھیں۔ اُسے وہ ضرب المثل یاد آئی۔

کشمیر میں جا کے ہم نے دیکھی ایک عجیب بات عورتیں ہیں مثل پری، آدمی جن ذات ۔۔۔۔۔۔۔ دو گوجریاں، جوان سانولی سلونی، گدرائی ہوئیں، جیسے رسیلی جامن، تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے گزر گئیں۔ ایک ڈرائیور نے اپنی لاری چشمے کے کنارے ٹھہرا لی اور انجن اور پہیے ٹھنڈے کرنے لگا۔ لاری میں ایک موٹے سیٹھ کا موٹا کتا، اس کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگا۔ "ٹامی شٹ اپ ٹامی شٹ اپ" موٹے سیٹھ نے کئی بار کہا لیکن کتا نہ رکا اور لاری کے موڑ پر گزر جانے تک بھونکتا رہا۔

اب سورج صبح اور دوپہر کے درمیانی وقفے میں آ گیا تھا اور اس نے چلنے کی ٹھانی۔ اس نے سوچا کہ آج رات وہ سو میل کے ڈاک بنگلے میں قیام کرے گا۔ گڑھی تو وہ آج رات کسی طرح نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اپنی اوک میں چشمے کا صاف و شفاف پانی پینے کے لیے بھرا اور پھر رک گیا۔ خاموش قدموں سے ایک عورت اس کے قریب آ گئی تھی۔ نوجوان سی اور کچھ فربہ اندام۔ اس نے نیلے پھولوں والی سوسی کی ایک بھاری شلوار پہن رکھی تھی اور اس پہ سیاہ قمیض جو اس کی ابھری ہوئی چھاتیوں کے گول خم نظر آتے اور چشمے کا صاف و شفاف پانی اس کی اوک سے باہر چھلکنے لگا اور کچھ عرصے کے بعد اس کے نچلے پیاسے سُرخ لبوں کی طرف دیکھ کر اسے اپنا سوال بے معنی سا معلوم ہوا۔ عورت چشمے میں سے اوک بھر بھر کر اپنی پیاس بجھاتی اور اس کی پیاس تیز ہوتی گئی۔۔۔ عورت کے لب اور گال گیلے ہو گئے اور کانوں کے قریب بل کھاتی ہوئی زلف بھی اور پھر یکایک شعلوں کی نگاہیں جلیں، عورت نے مسکرا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

شروع کیے۔

اس نے پوچھا "تم کہاں جا رہی ہو؟"

عورت نے کہا "میں نگر میں اپنے میکے گئی تھی۔ اب بلند کوٹ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔"

"بلند کوٹ کدھر ہے؟"

عورت نے کہا "یہاں سے سات آٹھ کوس تک تو میں اسی سڑک پر چلوں گی پھر آگے جنگل سے ایک راستہ اوپر پہاڑ کی طرف چڑھتا ہے۔ وہ راستہ ہمارے بلند کوٹ کی طرف جاتا ہے۔ بہت اونچی اور سرد جگہ ہے۔"

"تو پھر تم وہاں کیوں رہتی ہو۔ یہاں دیکھو کتنا خوشگوار موسم ہے اور اس چشمے کا پانی کتنا ٹھنڈا اور میٹھا ہے۔"

عورت نے ہنس کر کہا "ہم بکروال لوگ ہیں، ہم بھیڑوں، بکریوں بھینسوں کے گلّے پالتے ہیں۔ آج کل ان اونچے علاقوں پر بہت عمدہ عمدہ ہری ہری گھاس ہوتی ہے۔ جو برف کے گھل جانے پر پھوٹتی ہے اس باریک نرم اور ہری دوب کو ہمارے مویشی بہت شوق سے کھاتے ہیں اور چشمے تو وہاں اس سے بھی زیادہ ٹھنڈے اور میٹھے ہیں۔"

اس نے بات کا رُخ بدل کر کہا "کیا تم نے کبھی موٹر کی سواری کی ہے؟"

"ہاں ایک بار لاری میں بیٹھی تھی۔ جب میری شادی ہوئی تھی۔"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"دو سال۔"

وہ اپنا رختِ سفر باندھنے لگا۔ عورت کی ناک پر پانی کی دو بوندیں ابھی تک لٹک رہی تھیں۔ اور گیلی زلف داہنے گال سے چپک گئی تھی اس نے کہا "تمہاری ناک پر پانی کی دو بوندیں ہیں۔" اور پھر وہ یکایک دونوں ہنسنے لگے۔ دو بوندیں، دو سال، دو گولائیاں اور اس نے آہستہ سے کہا "آؤ

تم میری کار میں بیٹھ جاؤ۔ کم از کم سات آٹھ کوس تک تو میں تمہیں ساتھ لے جا سکتا ہوں۔"

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عورت ہچکچائی۔ لیکن موٹر کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اس نے اُسے اندر دھکیل دیا اور پھر کہا یہ موٹر بھی دو آدمیوں کے سفر کے لیے بنائی گئی تھی؟ ایک مرد اور غالباً ایک عورت اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھ دیا۔ عورت کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری پیدا ہوئی۔ جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جاتی ہیں موٹر بھاگتی گئی اور اس کا ہر نفس آتشیں ہوتا گیا۔ آگ اور سمندر جن میں بلند کوٹ کی رفعتیں غرق ہو جاتی ہیں اور وقت مٹ جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب وہ چو میل کے ڈاک بنگلے پر پہنچا تو ہر طرف شام کی اداسی چھا رہی تھی۔ سامنے کا سیاہ پہاڑ کسی وسیع قلعے کی دیوار معلوم ہو رہا تھا اور سرو کے درختوں کی چوٹیاں پہرے داروں کی بندوقیں۔ اب وہ پھر اکیلا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے قلعے کی دیوار سے، پہرے داروں کی بندوقوں سے، فضا کی تنہائی سے ڈر محسوس ہوا۔ اپنے آپ سے ڈر، اس تیرگی سے ڈر جو اُس کی روح پر چھائی ہوئی تھی۔ رات کے گہرے سایوں کی طرح، جیسے وہ اُسی افسردگی کے دلدل میں اندر ہی اندر دھنسا جا رہا ہو۔ اس نے ڈاک بنگلے کے بیرے کو آواز دے کر کہا "ایک وائٹ ہارس" یکایک کوئی نظر نہ آنے والا پرندہ کسی درخت پر اپنے پر پھڑپھڑانے لگا پھر وہ بول اٹھے ٹری ری ری، اور جیسے کہتے ہیں، پیں، پیں، پی، پی اور وہ پیتا گیا۔ اور اُس کے دل کی اداسی بڑھتی گئی۔ ڈاک بنگلے میں اس وقت کوئی نہ تھا اور اس نے سوچا کہ وہ اسی وقت گیراج میں جا کر اپنی موٹر سے لپٹ جائے۔ اور آنسو بہا بہا کر کہے "میں اکیلا ہوں، میری جان، میں اکیلا ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔" ۔ ۔ ۔ ۔ ٹری ری ری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔ پی ۔ ۔ ۔ ۔ پی ۔ ۔ ۔ ۔ پی ۔ کیا وہ جیے یا پیئے ۔ ۔ ۔ ۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بوتل خالی ہوگئی اور وہ میز پر سر ٹیک کر جھک جانے کو تھا کہ یکایک کسی نے اس کے شانے کو ہلایا۔ بیرا اُس کے پاس کھڑا تھا اور اس کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔

"تم کون ہو؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام زبیدہ ہے" عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھا اور کمرے کے اندر جانے کے لیے مڑا۔ بیرے نے اسے سہارا دینا چاہا۔ لیکن اس نے اسے جھڑک کر کہا "ہٹ جاؤ۔ میں کمرے میں خود چلا جاؤں گا" وہ اس وقت اس جری سیاح کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ جو کسی دشوار گزار برفستان میں سفر کر رہا ہو۔ ایک سیاہ کہر سی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، صرف کمرے میں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا روشنی چاروں طرف تاریکی کا سمندر اور بیچ میں روشنی کا مینار ...... وہ اُس روشنی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ شاید وہ اب بھی بچ نکلے۔ اور پھر اُس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جان عزیز کے مقابلے میں دس روپے کے نوٹ کی کیا اہمیت تھی۔ کاغذ کا حقیر ٹکڑا۔ بوتل اپنے سامنے دیکھ کر اس نے سوچا۔ اب میں بچ جاؤں گا۔ اب اس دلدل میں نہیں دھنسوں گا۔ اور اس نے بوتل کو زور سے گردن سے پکڑ لیا۔ شاید کہیں وہ اُس کا دامن چھڑا کر نہ بھاگ جائے۔ اس نے بیرے کو آواز دی۔

"جی سرکار؟"

"ایک مرغی بھون لو، دیکھو دُبلی پتلی نہ ہو"

"بہت اچھا سرکار"

"اور ہاں دیکھو" اُس نے بیرے کے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دے کر کہا "ایک ——— لے آؤ، دیکھو دبلی پتلی نہ ہو۔ تمہیں بھی انعام ملے گا"

بیرے کی باچھیں کھل گئیں۔ آنکھیں چمک اٹھیں، گردن کی رگیں ایک

قصاب کی طرح تن گئیں۔ اس نے خوش ہو کر کہا "حضور بے فکر رہیں۔ ایسا عمدہ چوزہ لاؤں گا کہ ......"

"جاؤ جاؤ" اُس نے جلدی سے کہا۔ اور بوتل کو گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔

ڈاک بنگلے کے باغ میں جھینگر اور مینڈک باری باری بول رہے تھے جھینگے کہتے ہیں ہیں ہیں۔ مینڈک کہتے ٹرّی ری ری۔ پھر دونوں چپ ہو جاتے اور جاتے گا۔ یکایک اس نے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اور وہ رُک گیا۔ بیرے نے عورت کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ عورت دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ ... آؤ ... اس نے عورت کی طرف ہاتھ ہلا کر جھومتے ہوئے کہا۔ ادھر آؤ۔ روشنی اِدھر ہے"

عورت جھجکتے ہوئے قدموں سے قریب آگئی تھی۔ اس کے بالوں میں بیچ درمیان سے ایک سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چاندی کے تار کی طرح اور اس نے دونوں طرف بالوں میں پُر تکلف انداز میں سجا لگایا ہوا تھا۔ سستے کا موم بالوں پر لیمپ کے انعکاس سے بار بار چمک اٹھتا تھا۔ اس کے کانوں میں چاندی کی ایک ایک بالی لٹک رہی تھی۔

اس نے عورت کے شانے پر جھک کر راز دارانہ لہجہ میں کہا "کیوں تم اداس ہو .... تمہارا کیا نام ہے؟"

"زبیدہ" اس نے بے جان سے لہجہ میں کہا۔

"شبیدہ .... شبیدہ ہ ہ ... اس نے ہنس کر کہا "شبیدہ ......

ہوں ... کیا خوب ...." اُس نے اس کے چکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کہا: "یہ کیا ہے ۔۔۔۔ شبیدہ ۔۔۔۔ پیاری ش ۔۔۔۔ ش ۔۔۔۔ شبیدہ ۔۔۔۔؟

یہ سمجھا ہے۔ یہ موم اور جنگل کے جگنو سے بنتا ہے۔ اس سے بال خوبصورت ۔۔۔۔"

"خوب شورت؟ ۔۔۔۔ خوب شودت شبیدآ ۔۔۔۔ آ ۔۔۔۔

اس نے ہنسی اور ہچکی کے بیچ کے لہجہ میں کہا "تم بہت خوب شورت ہو شبیدہ" ۔۔۔۔ اس نے زبیدہ کے صاف اور گلابی رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: "تم ۔۔۔۔ تم ۔۔۔۔ شبیدہ ہو ۔۔۔۔؟ ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ تم میری ماں ہو! ہی ہی ہی"

اور وہ اس کے قریب گیا۔

عورت نے یکایک اس کے بازوؤں کو جھٹک دیا۔ جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

"ہاں ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔" وہ چلا کر بولا: "ش۔ ش۔ شبیدہ ماں ہے ۔۔۔۔ شبیدہ میری بہن ہے ۔۔۔۔ ش ش شبیدہ میں گنہگار ہوں۔ شبیدہ تم یہاں کیوں آئیں ۔۔۔۔ آخ ۔۔۔۔ ہیں؟"

"میں غریب ہوں" زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔

"غریب؟ ہی ہی ہی"

میرا بچہ بیمار ہے؟ جرا میرا ننھا سا جرا۔ ڈاگ دار (ڈاکٹر) نے کہا ہے۔ اسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ چار روپے فیس مانگتا ہے۔ بیرے کے مجھے صرف تین روپے دیئے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے ایک روپیہ اور دیدو"

"نمونیا؟ ہی ہی ہی ۔۔۔۔ اسے خ ۔۔۔۔ خ ۔۔۔۔ خیراتی ہسپتال لے جاؤ نا ۔۔۔۔ نمونیا ۔۔۔۔ ننھا جرا ۔۔۔۔"

"یہاں ایک ہی تو ہسپتال ہے" عورت نے اداس لہجہ میں کہا "اور وہ بھی خیراتی ۔۔۔۔ میرے اللہ ۔۔۔۔ میں کیا کروں ۔۔۔۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں ۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھے ایک روپیہ اور دے دینا ۔۔۔۔ صرف ایک روپیہ"

"بش ۔۔۔۔ بش ۔۔۔۔ فکر نہ کرو ۔۔۔۔ ننھی شبیدہ۔ وہ؟ ——— میں اکیلا ہوں ۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے بچاؤ۔ شبیدہ ۔۔۔۔" اس نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ سویا پڑا تھا۔ عورت کے گلے میں اس کے بازو حمائل تھے۔ جیسے "وائٹ ہارس" کی بوتل پر اس کی انگلیاں۔ لیمپ کی مدھم روشنی جھلملا رہی تھی کالی رات کے سناٹے میں نظر نہ آنے والے جھینگے اور دردنے ابھی تک بحث کیے جاتے تھے ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ پی ۔۔۔۔ پی ۔۔۔۔ پی ۔۔۔۔ لیکن انہیں سننے والا وہاں موجود نہ تھا۔ کھائی اس کے سر پہ ہموار ہو چکی تھی۔

جب وہ جاگا، تو خمار اتر چکا تھا۔ روشنی بجھ گئی تھی۔ سائے غائب ہو چکے تھے۔ جھینگے اور دردنے خاموش تھے۔ صبح کا ہلکا سا پرتو چاروں طرف چھن رہا تھا۔ وہ ابھی تک اس کی آغوش میں مدہوش پڑی تھی۔ برہنہ تکیے پہ آراستہ کیے ہوئے بال پریشان تھے اور سپیدہ گردن کے ان حصوں پر سرخ سرخ نشان تھے۔ جنہیں وہ بار بار چومتا رہا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سڈول، گداز، سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، وہ آہستہ سے اس کے پنڈے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

عورت کے سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی۔ جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں —— اس کے لبوں سے اک آہ سی نکلی اور اس نے آہستہ سے اُسی مدہوشی کے عالم میں کہا: "جیرے ۔۔۔۔ پیارے ننھے جیرے ۔۔۔۔۔" اور پھر اس کے نیم وا لب اسی طرح آپس میں ملے جیسے ماں اپنے پیارے بیٹے کو چوم رہی ہو ۔۔۔ ننھا جیرا؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔

یکایک وہ چونک پڑا۔ گذری ہوئی رات کے موہوم سے سائے اس کی آنکھوں کے آگے آنے لگے ۔۔۔۔۔۔ ننھا جیرا ۔۔۔۔۔ تو سونیا ۔۔۔۔۔

ڈاک دار ۔۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔۔ کانپنے لگا ۔۔۔۔۔ تین روپے ۔۔۔۔۔

چار روپے ۔۔۔۔ صرف ایک روپیہ۔ اس نے فوراً اپنے بازو اس کی گردن سے ہٹا لیے۔ ننھا جیرا ۔۔۔۔۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں سے زنا کر رہا ہو ۔۔۔۔۔ اور وہ یک لخت بستر سے اچھل کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس عورت کی طرف تکنے لگا جو اب جاگ گئی تھی۔ اور برہنہ تھی۔ اور ساری رات اس کی آغوش میں رہی تھی۔

وہ چیخ کر کہنے لگا: "چھپا لو، چھپا لو۔ اپنے آپ کو اس کمبل میں ۔۔۔۔ دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے کیوں اس طرح پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو ۔۔۔۔۔ سنتی نہیں ہو کیا؟ ۔۔۔۔ میں کہتا ہوں، اٹھو، اٹھو ۔۔۔۔۔ میرے بستر سے ۔۔۔۔۔۔ یہ لو ۔۔۔۔۔۔ یہ لو ۔۔۔۔

ایک روپیہ۔ دو روپے، تین روپے، چار روپے، یہ سب لے لو، بھاگو یہاں سے بھاگو! بھاگو!! بھاگو!!!"

اور اس نے اس عورت کو کمبل اُڑھا کر اس کے کپڑے اس کے ہاتھ میں دے کر اسے کمرے سے نکال دیا۔

بہت دیر تک وہ بستر پر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ دل و دماغ پر ایک مبہم

سی الجھن مکڑی کے جالے کی طرح تنی ہوئی تھی جو اُسے بار بار پریشان کر رہی تھی۔ اور وہ کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ بار بار اپنے الجھے ہوئے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس مکڑی کے جالے کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر جب بیرے نے آکر اُس سے کہا: "صاحب غسلخانہ میں گرم پانی دھرا ہے۔" تو وہ بے دلی سے اٹھا اور پوٹاشیم پرمینگنیٹ کی پچکاری اٹھا کر غسلخانے میں گھس گیا۔ طبیعت بے مزہ سی ہو گئی تھی اور منہ کا کڑوا کسیلا ذائقہ ہوش آنے پر بھی دور نہ ہوا تھا۔ شانے بوجھل سے تھے۔ نہا کر وہ برآمدے میں میز پر کہنیاں ٹیک کر ناشتے کا انتظار کرتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔

ہوشیار بیرے نے ناشتے پر بیئر کی بوتل حاضر کر دی۔ بیئر کے خوش رنگ سیال نے آہستہ آہستہ اس کے خیالات کی رَو کو بدل دیا۔ اس کی طبیعت مفرح ہوتی گئی وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔ اور سیٹیاں بجانے لگا۔ بیتی ہوئی راتوں کے لمحے خوش گوار اور دلکش بنتے چلے گئے۔ ستھرے سے چمکتے ہوئے بال ۔۔۔۔۔۔۔۔ سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے زخم ۔۔۔۔۔۔۔۔ نہالو کا غیر فانی حسن، بلبل کا نغمہ، پپیہے کی پی پی اور سیب کے پھول چاندنی میں ہنستے ہوئے یکایک کسی راستے میں چھلکتے ہوئے چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اس کی آنکھوں کے سامنے خوشی سے اُچھلنے اور اُبل اُبل کر قہقہہ لگانے لگا اور اُسے اپنی کار کی یاد آئی جو گیرج میں پڑی اس کی راہ تک رہی تھی وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے بیرے کو انعام دے کر پوچھا: "گڑھی کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنے میل دور ہو گا؟"

"ایک سو دس میل سرکار۔"

"ہاں بیرے کا کیا نام ہے؟"

"خادم شاہ، حضور۔"

"ہم شا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"بہت اچھا آدمی ہے۔" بیرے نے کہا۔ "صاحب لوگوں کا پرانا خادم ہے حضور۔۔۔۔۔۔"

ڈاک بنگلے کے قریب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اُسے ایک نیلے رنگ کی کار مل گئی جو ڈاک بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ ایک بھاری جسم اور دُہری ٹھوڑی والا آدمی جس نے سیاہ پھُندنے والی رومی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کار چلا رہا تھا۔ اس کی بغل میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلی سوسی کی شلوار، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے زخم اور آنکھوں میں عادی مجرموں کی سی بے جان اداسی اور وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا۔۔۔۔۔۔ غریب عورتوں نے اپنی خیالی عصمت کی خاطر پہاڑوں پر بلند کوٹ بنائے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان کے میکے اور سسرال، ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک اور ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک محدود تھے۔ اس نے دل ہی دل میں خداوند لایزال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ جس نے ان لوگوں کو غریب بنا کر اس کے لیے دل کش راتیں مہیا کی تھیں۔ زبیدہ، وائٹ ہارس اور بھنا ہوا مرغ۔۔۔۔۔ الٰہی کیسی کیسی نعمتیں تُو نے بنائی ہیں۔۔۔۔۔ اس کے تخیل میں گوڑھی کا ڈاک بنگلہ ایک پرستانی قلعہ نظر آنے لگا اور اس نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔

موٹر کے آگے اور پیچھے، چیڑھ اور دیودار کے گھنے اور سبز جنگلوں کے درمیان چاندی کے تار کی طرح چمکتی ہوئی وہ پکی سڑک پھیلتی جا رہی ہے ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک ایک امیر کی جیب سے دوسرے امیر کی جیب تک، یہ نقرئی تار ہے جس نے انسانوں کے دل تاریک کر دیئے ہیں عورتوں کی عصمتیں ویران کر ڈالی ہیں اور سماج کی روح کو آتشک کے جہنم میں جھلسا دیا ہے۔

اندھیرے کا ساتھی

پھول وتی نے قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور آئینے نے اس سے کہا: تم بہت خوبصورت ہو۔ تمہارے نین کٹوروں میں شراب کی سی مستی لبا لب چھائی رہتی ہے کہ برٹش پولیس تمہیں کسی وقت بھی شبے میں گرفتار کر سکتی ہے۔ تمہارے گلابی ہونٹ پھولوں کی پنکھڑیاں ہیں جن پر شہد کی مکھی دھوکا کھا کر کبھی بھی بیٹھ سکتی ہے۔ تمہاری چال جیسے پانی کی اٹھلاتی ہوئی لہر، آواز جیسے فضا میں لچکتی ہوئی قوس قزح۔ قد جیسے تم وہ عورت ہو جس کے لیے شاعر شعر کہتے ہیں۔ سیاست دان جھوٹ بولتے ہیں۔ تاجر بلیک مارکیٹ کرتے ہیں اور مولوی اور پنڈت ماتھا رگڑ رگڑ کر خدا کو یاد کرتے ہیں۔ تمہارے لیے انسان نے کیڑوں سے ریشم مانگا، بھوری مٹی سے کانچ پیدا کیا۔ دھرتی کی چھاتی میں گھس کر سونا حاصل کیا اور سمندر میں ڈوب کر موتی تلاش کیے۔ تمہارے لیے انسان نے گھر بنایا، گھر کے گرد باغ لگایا۔ باغ میں پھول کھلائے۔ اور پھولوں کو توڑ کر تمہارے بالوں میں ٹانک دیا۔ تم جو ہر انسان کی آرزو کی خوشبو ہو ہر خوشبو کا صلہ ہو۔ تم آج کیوں رو رہی ہو؟"

پھول وتی نے اپنی بڑی بڑی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور سسک کر کہا:

"ایسا ہی تھا تو پھر انھوں نے مجھے کیوں مارا؟" یہ پھول ایسے رخسار کس نے چانٹے مار مار کر لال کر دیئے؟ کیا یہ بھی آئینے کا دھوکہ ہے؟"

"میں کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔" آئینے نے کہا۔ "جو کچھ تم ہو جو تم پر گزری ہے وہ سب میرے عکس میں موجود ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کچھ اور بھی کیونکہ میں صرف تمہارا ماضی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نہیں ہوں تمہارا مستقبل بھی ہوں۔ اگر غور سے مجھے دیکھوگی تو تمہیں وہ بھی نظر آئیگا جو آگے آنے والا ہے۔ مجھے لوگوں سے بھی شکوہ ہے۔ وہ جو شیشوں کے پاس جاتے ہیں اور مجھ سے کچھ نہیں پوچھتے۔ اگر وہ دن میں صرف ایک بار مجھے غور سے دیکھ لیا کریں تو انہیں کہیں جانے کی ضرورت نہ پڑے؟"

"آگے کیا ہونے والا ہے؟" پھول وتی کی پھٹی پھٹی آنکھیں متوحش نگاہوں سے آئینے کو دیکھنے لگیں۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی پیاسا نہ مارا تھا کبھی پھول سے بھی کوئی کڑوی بات تک نہ کی تھی۔ ابھی چھ مہینے تو ہماری شادی کو ہوئے ہیں۔ آج سے تین ماہ پہلے تو ہم کشمیر میں تھے۔ ہنی مون منا رہے تھے۔ تمہیں یاد نہیں ہے؟ ہم وہاں کتنے خوش تھے۔

پھول وتی نے غور سے آئینے میں دیکھا اور یکایک کانچ کی سطح اس طرح متلاطم ہوگئی جیسے ہوا کے جھونکے سے چادر آب لہرا جاتی ہے۔ سبز ڈھلوان کے ساتھ ساتھ فیروزہ پوری نالہ بہہ رہا تھا۔ جب پانی ڈھلوان سے بہتا ہے تو چھوٹے چھوٹے نیلے نیلے پتھر اس کے ساتھ بجتے ہیں۔ پانی پھسلتا ہے تو مچھلیوں کی کمر لچکتی ہے۔ اور کوئی کسی کی لچکتی ہوئی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور کوئی گھبرا کر پلٹ کر کسی کے سینے سے لگ کر خوشی سے سسکنے لگتا ہے۔ خوشی کے بھی آنسو ہوتے ہیں۔ پھول وتی کے غم کے آنسوؤں میں وہ خوشی کے آنسو چھلک اٹھے۔ ہائے کیسے پیارے دن تھے وہ! ڈھلوان پر اخروٹ کے درختوں پر چھوٹے چھوٹے سبز اخروٹ لٹک رہے تھے اور سطح زمین پر انگیوں کے لاکھوں نیلے نیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور اپنی آنکھیں کھول کر محبت کے دیوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ اک آئینہ حیران ہر سانس محبت کی خوشبو سے لرزاں۔

دمکتی ہوئی چاندنی میں پانی کے کنارے بیٹھے بیٹھے جب کوئی تراوٹ مچھلی چمک اٹھتی اور زیر آب پھسلتے ہوئے کہیں چلی جاتی۔ تو پھول وتی حیران ہو کر اپنے آپ سے پوچھتی یہ مچھلی کہاں جا رہی ہے؟ کیا اس دنیا میں کسی کا کوئی محبوب ہے؟ جس کے پاس سب کچھ تج کے نظریں جھکا کے چلا جانا ہوتا ہے۔ ایسا ہی تھا تو وہ تنے دن اپنے محبوب کے بغیر کیسے رہی؟ کیسی خاموش سنسان غیر متلاطم زندگی تھی: وہ ہاتھوں

کے لمس سے بے گانہ آنکھوں کے سوال سے ناآشنا۔ دل کی خلش سے اجنبی پھول وتی کا دل آسودہ جذبات سے لبریز ہوگیا۔ اور اس نے سوچا اس سے آگے کچھ نہیں ہے اور اس نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا چہرہ اپنے خاوند کے کوٹ میں چھپا لیا۔

اور گردھاری نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا: کل ہم لوگ مرگ جائیں گے۔ پھول وتی نے کوٹ کے کالر سے سر اٹھا کر اخروٹ کے درختوں سے پرے گل مرگ کے پہاڑ کو دیکھا۔ گل مرگ کا جنگل چاندنی میں سویا پڑا تھا اور اس سوتے ہوئے جنگل کی چوٹی پر پہاڑ کے پیالے میں گل مرگ تھا۔

گل مرگ کا پیالہ گویا ان کی خوشبوؤں کا لبریز پیالہ تھا۔ وہ پیالہ نہ تھا محبت کا ہالہ تھا جس نے ان دونوں روحوں کو اپنے مرکز میں لے لیا تھا۔ جب محبت آتی ہے تو اور کوئی نہیں رہتا، کوئی سماج نہیں رہتا اور کوئی مقام نہیں رہتا۔ اور کسی دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں رہتا۔ محبت، محبت کرنے والوں کو بالکل اکیلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ اس دنیا سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ ساری دھرتی گویا صرف ان دونوں کی ہو جاتی ہے۔ محبت کے بعد پھول صرف ان دونوں کے لیے مہکتے ہیں۔ لوگ بازاروں میں صرف ان کے لیے چلتے ہیں۔ لکڑہارے جنگل میں لکڑیاں، اخروٹ، پھول اور پھل صرف ان کے لیے لاتے ہیں۔ آسمان پر بادل ان کے لیے اڑتے ہیں۔ اور زمین پر وہ اکیلا اجنبی شاعر پگڈنڈی پر چلتا ہوا صرف ان کے لیے گیت گاتا ہے۔ الپتھر کی جھیل پر برف کے تودوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے پھول وتی نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ چاروں طرف برف پوش ٹیلوں کی چوٹیاں مغرور سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہ چوٹیاں جو تبت کو دیکھتی ہیں۔ بھوٹان کو دیکھتی ہیں سکم کو دیکھتی ہیں۔ لداخ کو دیکھتی ہیں۔ یہ چوٹیاں جو کسی کو نہیں دیکھتی ہیں۔ صرف محبت کے دو متوالوں کو دیکھتی ہیں جو الپتھر کی جھیل کے کنارے برف کے تودوں کے درمیان ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہیں۔ کتنے ہزاروں لاکھوں سال کے بعد یہ لمحہ آیا ہے جب ہر چوٹی کے سنہرے سپنے پورے ہوئے ہیں۔ اب ان چوٹیوں کو کسی کا انتظار نہ رہے گا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

آنے والے آگئے۔

مگر وقت تھمتا نہیں ہے۔ تھمتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس لیے آنے والے آتے ہیں اور آکر چلے جاتے ہیں۔ وہ تین ماہ ہنی مون کے کتنی جلدی ختم ہو گئے۔

پھول وتی نے مایوس ہو کر دونوں ہاتھ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لیے اور آئینے کی طرف دیکھ کر حسرت سے پوچھا کہاں گئے وہ دن؟ اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئے؟ وہ محبت اور امیدوں کے جگمگاتے ہوئے دن کہاں چلے گئے اور ان کے جاتے ہی یہ زردی کا چانٹا۔۔۔۔!

پھول وتی نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے پھول سے نازک رخسار پر رکھ لیا۔ جہاں ابھی تک گردھاری کے چانٹے کے نشان تھے وہ دن اس لیے ختم ہو گئے کیوں کہ پیسے ختم ہو گئے تھے۔ ہنی مون کے لیے تمہارے باپ کے دیئے ہوئے پیسے ختم ہو گئے تھے اور گردھاری کی چھٹی بھی ختم ہو گئی تھی اور گرم میدانوں کی کٹھن محنت اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ آئینے نے جواب دیا۔

چھ مہینوں میں ہی وہ پھر مجھ سے پیسے مانگنے لگے ہیں۔ اپنے باپ سے جا کر پیسے مانگ کر لاؤ۔

تو جاؤ۔

کیا منہ لے کے جاؤں۔ شادی پر اتنا کچھ تو انہوں نے دیا تھا گھر کے بھنڈار بھر دیئے تھے۔

جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ چانٹا کھانا پڑے گا۔

پھول وتی ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ اس نے آئینے سے منہ موڑ لیا۔

گردھاری کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک خوش اخلاق، خوش رو، خوش مزاج نوجوان تھا اور ایک چھوٹے سے سرکاری دفتر میں ایک چھوٹا سا سرکاری افسر تھا۔ تنخواہ بھی چھوٹی سی تھی۔ بس ساڑھے تین سو روپے اور اوپر کی آمدنی بالکل نہ تھی اور گردھاری نوجوان تھا۔ نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی جوانی کی ہزاروں آرزوئیں اور امنگیں ایسی ہوتی ہیں جو معصوم ہوتے ہوئے بھی

ساڑھے تین سو میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے چھ ماہ ہی میں گردھاری پر ایک ہزار روپیہ قرض ہو گیا۔

اب کیسے قرض ہو گیا اس کی تفصیل تو وہ بتا نہیں سکتا۔ اسے کوئی بری لت بھی نہیں تھی۔ دُھت شراب وہ نہیں پیتا تھا بس کبھی کبھی چکھ لیتا تھا۔ جوئے کی بھی عادت نہ تھی۔ یونہی سٹے میں پیسہ دو پیسہ پوائنٹ وہ ہار جاتا تھا۔ ریس کالے چسکے نہ تھا مادہ خیالے انجکشن وہ نہیں لیتا تھا کوٹھوں پر وہ نہیں جاتا تھا۔

وہ ایک سیدھا سادا آرام پسند سکون طلب نوجوان تھا۔ جسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ جسے اچھے کپڑوں کا شوق تھا۔ وہ ایک سلیقے سے سجے ہوئے گھر میں رہنا چاہتا تھا۔ جس کے ڈرائنگ روم میں خوبصورت پردے جھول رہے ہوں اور نازک منقش صراحیوں میں سے نرگسی پھول جھانکتے ہوں اور اس کی بیوی سنہری چوڑیوں سے سجی کلائی بڑھا کر اپنی نازک انگلیوں سے ریڈیو گرام کا سوئچ کھولتی ہو۔

کیسے معصوم خواب تھے اس کے کتنے ادھورے سپنے جو محض اس لیے پورے نہیں ہوتے تھے کہ اس کی بیوی میکے جا کر اپنے باپ سے روپیہ مانگنے سے احتراز کرتی تھی۔۔۔۔ آخر اس میں ہرج کیا۔ آخر اس کا لکھ پتی باپ اتنی دولت اپنے سر پر اٹھا کر چتا میں لے جائے گا۔ ہزار دو ہزار روپیہ ہوتا ہی کیا ہے۔ مانگتے ہی اس کا باپ اسے یوں چٹکی بجاتے دے دے گا۔

مگر یہ جاہل لڑکی ہے کہ مانتی ہی نہیں!

اس لیے چانٹا! دو چار تھپڑ اور گھونسے۔ ایک بار بالوں کو پکڑ کر گھسیٹنا بھی انتہائی بری باتیں۔ مگر کبھی کبھی ضروری بھی ہو جاتی ہیں! [illegible] کون میں کسی برے کام کے لیے روپیہ مانگ رہا ہوں۔ شراب کے لیے جوئے کے لیے سٹے کے لیے۔ ریس یا رنڈی بازی کے لیے مانگ رہا ہوں جو اس شدت سے میکے جانے سے انکار کر رہی ہے۔ برابر روئے جا رہی ہے۔ کتنی پیاری، مگر کتنی بے وقوف لڑکی ہے۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

گر بیچے تو اسے جانا ہی پڑے گا ورنہ قرضہ کیسے چکایا جائے گا۔ اور یہ ضروری سامان کیسے آئے گا۔

چند روز کی میں میں تو تو کے بعد پھول وتی کو اپنے میکے جانا ہی پڑا۔ وہ وہاں پر دو مہینے رہی۔ اس کے باپ نے اُسے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ یہ روپیہ میں آخری بار دے رہا ہوں۔ مجھے لالچی داماد پسند نہیں ہے۔ میں گردھاری کو ایسا سمجھتا تھا۔ تم لوگوں کو ساڑھے تین سو میں گزر کرنا چاہیئے۔

دو ماہ کے بعد جب پھول وتی پانچ ہزار روپیہ لے کر لوٹی تو گردھاری نے اُسے گلے لگا لیا۔ جھوٹ موٹ نہیں اور محض روپے کی خاطر سے نہیں۔ واقعی وہ اپنی بیوی کی طویل غیر حاضری سے اداس ہو چلا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے شدید محبت تھی کبھی کبھی اس کی غیر حاضری میں اس نے یہ بھی سوچا تھا اس نے خواہ مخواہ اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اگر وہ لوگ تھوڑی سی بچت کر لیتے۔ تھوڑا سا اپنا خرچ کم کر دیتے تو ممکن تھا کہ قرضہ ختم ہو جاتا۔ کئی بار اس نے یوں بھی سوچا۔ اچھا اب کے وہ روپیہ لے آئے۔ آئندہ میں کبھی اپنی بیوی کو پریشان نہیں کروں گا۔ واقعی برا لگتا ہے کسی سے روپیہ مانگنا۔ چاہے وہ اپنا سسر ہی کیوں نہ ہو۔

اس واقعے کے بعد دو سال بڑے اچھے گزرے۔ گردھاری نے اپنا قرضہ اتار دیا۔ اور باقی کے روپے بڑی خوش سلیقگی سے آہستہ آہستہ خرچ کیے کیونکہ اسے کوئی بری لت تو نہیں تھی مگر بری لت نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آخر پانچ ہزار ہوتے ہی کتنے ہیں ذرا غور فرمائیے۔ پانچ کے آگے تین صفر۔ تھوڑے عرصے کے بعد صفر پہ صفر۔ روپیہ تو شعلہ ہے۔ چند ثانیے بھڑک کر روشنی دیتا ہے پھر راکھ ہو جاتا ہے۔ اگر روپیہ ایک درخت ہوتا جو ہر سال پھل دیتا تو پھول وتی اور گردھاری کے گھر کا آنگن کتنا خوش گوار ہوتا۔ مگر جانے ان سائنس والوں کو کیا ہوا ہے۔ بجز چاند پر جانے کے لیے راکٹ بناتے ہیں۔ مگر معمولی گھروں میں روپے کے درخت نہیں اگاتے ہیں۔

اور اب تو پھول وتی کی گود میں ایک خوبصورت بچہ بھی کھیلتا تھا۔ گردھاری کو

اپنے لڑکے سے بڑا پیار تھا۔ اس نے اس کی پرورش کے لیے ایک آیا بھی رکھ لی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے بچے میں مگن تھے۔ پھول وتی بڑے سلیقے والی عورت تھی وہ اپنا چھوٹا سا گھر صاف شفاف اور ستھرا رکھتی۔ خود بھی ہر وقت سجی سجائی رہتی اس کے ڈرائنگ روم میں کہیں کوئی دھبہ نہ نظر آتا تھا۔ ڈرائننگ ٹیبل کا کانچ ہر وقت چمکتا نظر آتا۔ اس کی ساڑھی کبھی میلی نہ ہوتی۔ بال کبھی الجھے نہ ہوتے گلدانوں میں کبھی باسی پھول نہ ہوتے۔ وہ لوگ ہر تیسرے روز پکچر دیکھتے تھے ہر ساتویں روز مائی لارڈ ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ مائی لارڈ ہوٹل میں ان کی جگہ مخصوص تھی مغربی کونے میں نرم نرم گدّوں والا صوفہ۔ ڈھلیا کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدان اور احتراماً جھکا ہوا بیرہ۔ زندگی کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے جب کوئی احتراماً جھکتا ہے۔ چاہے چند لمحوں ہی کے لیے جھکے۔ چاہے چند پیسوں ہی کے لیے جھکے۔ مگر یہ لوگ یوں جھکتے کیوں ہیں اور دوسرے لوگ انہیں جھکا کے خوش کیوں ہوتے ہیں۔ شاید کسی کتاب میں اس سوال کا جواب نہ مل سکے گا۔!

دو سال کے بعد گھر میں پھر جھگڑا شروع ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے باتوں میں تلخی آنے لگی۔ وہ پانچ ہزار روپے کب کے خرچ ہو چکے تھے۔ اب پھر قرضہ بڑھنے لگا تھا۔ پھول وتی ہزار سگھڑاپے سے خرچ کرتی۔ مگر قرضہ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ گردھاری یوں تو بے حد شریف بلکہ مثالی خاوند تھا۔ مگر زندگی کی چند آسائشیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بغیر کوئی شریف آدمی کیسے رہ سکتا ہے۔ پھر منّے کا خرچ تھا منّے کی آیا کا خرچ تھا۔ اس پر گردھاری نے گھر کے لیے قسطوں پر ریفریجریٹر خرید لیا تھا۔ ریفریجریٹر کتنے کام کی چیز ہے۔ گرمیوں میں برف کی لگی ہوئی بیئر کی بوتل کتنا مزہ دیتی ہے۔ برف کی طرح ٹھنڈا دودھ کتنا لطف دیتا ہے۔ ریفریجریٹر میں رکھی ہوئی سبزیاں خراب نہیں ہوتیں جب چاہے بہت کھائیے۔ جب چاہے آئس کریم بنائیے شربت پیجئے۔ برف کی قاشوں پر وسکی ڈال کر زندگی کا لطف دوبالا کیجئے۔ گردھاری کو عرصے سے احساس، احساس تھا کہ اس کا گھر فریج کے بغیر سُونا سُونا سا ہے اس

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

لیے وہ بیوی کے منع کرنے پر بھی ایک روز فرج قسطوں پر خرید کے لے آیا۔ ریفریجریٹر کے آنے سے پھول وتی کو کچن میں بڑا آرام ملا۔ گھر میں آسائش کا ایک اور کونہ ابھر آیا۔ اور گھر کی خوبصورتی میں ایک اور رنگ کا اضافہ ہوا۔

مگر اب مشکل یہ آن پڑی کہ ہر ماہ تنخواہ میں سے اس کے لیے قسط کٹ جاتی اس کے اوپر مہنگے اور آیا کہ خرچ تھا ہاتھ تنگ ہونے لگا۔ قرضہ بڑھنے لگا۔ ہوتے ہوتے بیچ میں ایسا ہو گیا کہ گردھاری ریفریجریٹر کی چار قسطیں نہ دے سکا۔ ادھر کمپنی والوں کا نوٹس آ گیا۔ انہوں نے اب تک اس پہ بہت مہربانی کی تھی مگر اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگلے ایک ماہ کے اندر اندر گردھاری نے انہیں گزشتہ چار قسطیں ادا نہ کیں تو کمپنی ریفریجریٹر اٹھا کے لے جائے گی۔

لے جائیں! پھول وتی بڑی نخوت سے بولی۔ ہمیں نہیں چاہیئے۔

واہ! گردھاری فوراً بولا۔ اور یہ جو آٹھ قسطیں میں دے چکا ہوں وہ بے کار میں ضائع ہو جائیں گی۔

تو آٹھ ماہ ہم نے اسے استعمال بھی تو کیا ہے!

جب لوگ یہاں فریج نہیں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے

ہمیں لوگوں کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ گھر ہمارا ہے لوگوں کا نہیں ہے۔

پھول وتی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ مگر گردھاری نہ مانا۔ اس پر پھول وتی نے کہا:

تو گھر کا خرچ کم کر دو۔

کیا کم کر دوں۔ گردھاری گرج کر بولا۔

ہم ہر تیسرے روز سینما جاتے ہیں۔ اب ہفتے میں ایک روز جایا کریں گے پہلے ٹیکسی پر جاتے تھے اب بس میں چلے جائیں گے۔

زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپے بچ جائیں گے۔ اس سے کیا ہو گا۔

مجھے ہر ماہ نئی ساڑھی کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس پہلے کی بہت سی ہیں۔

تم نہیں جانتیں ہر ماہ فیشن بدلتا رہتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ گردھاری کی بیوی۔ ۔ ۔ ۔

آپ کے پاس سوٹ تو بہت ہیں۔ اگر نیا سوٹ نہ سلواتے تو ڈیڑھ سو روپے بچ جاتا۔ پھول وتی سہم کر بولی۔

تو کیا ننگا گھوموں؟ گردھاری چیخ کر بولا۔ اک ذرا سی آسائش زندگی میں چاہتا ہوں کوئی عیب نہیں پال رکھا ہیں نے۔ کوئی برائی مجھ میں نہیں ہے بس ذرا سلیقے سے میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس پہ تم میخ نکالتی ہو۔

میں کہاں میخ نکالتی ہوں۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے۔

دو ہزار سال سے وہی چادر میں پاؤں پھیلانے کی بات میں سن رہا ہوں بھگوان کرے ساری دنیا کی چادریں پھٹ جائیں! تم عورتوں کے پاس اور کوئی بات کہنے کو نہیں ہے؟ جب بات کرتی ہو یہی چادر سامنے لے آتی ہو؟ یہ چادر نہیں ہے انسان کی ساری امیدوں کا کفن ہے۔

پھول وتی چپ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد سر جھکا کے بولی میں الیف۔ اے پاس ہوں۔ کہیں نوکری کرا دو مجھے کسی آفس میں۔

بہت ہوا تو پچھتر روپے لے آؤ گی ہر مہینے۔ اس سے کیا ہو گا۔ پھر گھر کون دیکھے گا؟ کیا بات کرتی ہو۔ پھول وتی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ تو پھر یہ طے ہے کہ ریفریجریٹر واپس کر دیا جائے۔ اور گھر کا خرچ کم کر دیا جائے۔

گردھاری نے کہا۔ کچھ کم نہ ہو گا۔ ریفریجریٹر بھی واپس نہیں جائے گا! تمہیں میکے جانا پڑے گا۔

میں نہیں جاؤں گی۔

تمہارے پتا جی اتنے غریب نہیں ہیں کہ تین ہزار روپے نہ دے سکیں۔ اب کے صرف تین ہزار میں کام چل جائے گا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

آپ کو معلوم نہیں ہے۔ پتا جی کو بزنس میں پچھلے سال دس لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ ان کی مالی حالت بہت پتلی ہے۔ اب وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ تین ہزار کی رقم ہوتی ہی کیا ہے؟ نہیں، میں میکے نہیں جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر اپنے باپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔

یکایک گمر دھاری کو غصہ آ گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے زور سے پھول وتی کے ایک لات ماری۔ پھول وتی تیورا کے گر پڑی۔

ایک ماہ کے بعد جب پھول وتی اپنے میکے سے لوٹی تو ہزار روپے اس کے پرس میں تھے۔ مگر اب کے وہ پچھلی مرتبہ کی طرح خوش خوش گھر سے نہ آئی تھی۔ اب کے اس کا رنگ اڑا اڑا تھا۔ اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پتا جی نے اس کی بڑی بے عزتی کی۔ اسے روپے تو دے دیئے اور اس سے کہہ دیا کہ اب کے اگر وہ روپے کا مطالبہ کرنے آئی تو اسے دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیا جائے گا۔

پھول وتی رو رو کر کہنے لگی اب وہ میرا گھر نہیں ہے۔ اس گھر پر میرا کوئی حق نہیں ہے تم میرے جیون ساتھی ہو۔ بھگوان کے لیے مجھے میری نظروں میں مت گراؤ۔ گمر دھاری بھی آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو گلے سے لگا لیا۔ کیسے ظالم لوگ ہیں یہ تمہیں اپنی بیٹی سے زیادہ اپنا روپیہ پیارا ہے۔

مگر میں تو اب پرائی ہو چکی۔ میرا ان پر اب حق بھی کیا ہے۔

ہاں! ہاں ٹھیک ہے جانے دو۔ میں تمہیں خود وہاں کبھی نہ بھیجوں گا۔

بات آئی گئی۔ قصہ ختم ہو گیا۔ قرضہ اتر گیا۔ ریفریجریٹر ہمیشہ کے لیے گھر میں آ گیا۔ میاں بیوی اور منا گھر میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کے قریب پھر مزے میں گزرا۔ میاں بیوی ہر تیسرے روز سینما جاتے۔ ہر ساتویں دن موتی محل میں کھانا کھاتے۔ ہر ماہ نئی ساڑھی آتی۔ منا کے لیے عمدہ سے عمدہ کپڑے۔ مگر اب کے پھول وتی بہت محتاط ہو گئی۔ گھر کا خرچ بہت احتیاط سے کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سینما کی کلاس میں کمی کاٹ جاتی۔ کبھی ٹیکسی کے بجائے خاوند کو بس ہی میں لے آتی۔

کسی ماہ اس کا سوٹ کسی ماہ اپنی ساڑھی نہ خریدتی۔ گھر بڑے خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ مگر گمر دھاری کچھ خوش نہیں تھا۔ یوں تو اس کی زندگی میں سب کچھ موجود تھا۔ خوب صورت بیوی۔ پیار کرنے والی بیوی۔ ایک پیارا بچہ۔ پیارا سا ننھا سا گھر صاف ستھرا سلیقے سے سجا ہوا۔ ریڈیو گرام۔ ریفریجریٹر۔ ۔ ۔ ۔ بس کمی تھی تو صرف ایک کار کی۔ عرصے سے اس نے ایک چھوٹی سی گاڑی دیکھ رکھی تھی سبک اور سیاہ سیکنڈ ہینڈ اور صرف پانچ ہزار روپے۔ ایسی گاڑی آج کل آٹھ ہزار میں بھی نہ مل سکتی تھی۔ اپنی گاڑی ہو تو خرچ میں کتنی بچت ہو جاتی ہے۔ بس کا کرایہ ٹیکسی کا خرچ۔ کیو پر کھڑے کھڑے جو خون سوکھتا ہے۔ انسان کتنی مصیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ ایک گیلن ڈالو اور بیس میل سفر کر لو۔ بس میں کپڑے جلد میلے ہوتے ہیں۔ گاڑی آ جائے گی تو بڑے بڑے افسروں کو گھر بلایا جا سکے گا۔ رات کی دعوت ڈھنگ سے کی جا سکے گی۔ بڑے لوگوں سے ملنے کے لیے مناسب طریقے سے جا سکیں گے۔ گاڑی ہوگی تو ترقی بھی ہو جائے گی۔ انسان کی ترقی کے لیے گاڑی بے حد ضروری چیز ہے انسان محنتی ہو نہ ہو۔ دیانت دار ہو نہ ہو لیکن اگر اس کے پاس ایک گاڑی ہے۔

کئی دنوں سے گمر دھاری پھول وتی کو کچھ بتلا رہا تھا۔ پھول وتی سب سمجھ رہی تھی مگر کچھ نہ بولتی تھی۔ آخر ایک دن جب گمر دھاری نے اسے مارنے کے لیے پھر ہاتھ اٹھایا تو وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

آخر تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں میکے جاؤں اور تمہاری گاڑی کے لیے پانچ ہزار روپے اپنے باپ سے لے آؤں؟

میرا مطلب یہ ہے گمر دھاری آنا کانی کرتے ہوئے بولا۔ اگر وہ پانچ ہزار قرض دے دیں تو میں آہستہ آہستہ انہیں ادا کر دوں گا۔ گاڑی خریدنے کے بعد تو کوئی بھی اس گاڑی پر قرض دے دے گا۔ مگر گاڑی کو گروی کیسے رکھا جا سکتا؟ آخر میں ان کا داماد ہوں۔ کیا وہ میرے اتنا سا بھی۔ ۔ ۔ ۔؟

پھول وتی بات کاٹ کر بولی۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ ماں نے بیٹے کی ضرورت

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نہیں ہے۔ میں خود ہی میکے چلی جاتی ہوں اور پتا جی سے پیسے لے کے آتی ہوں!

گردھاری کو بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ صدمہ بھی ہوا۔ کچھ مسرت بھی ہوئی۔ بیٹھے بٹھائے مارپیٹ کے بغیر کام بن گیا۔ پھول وتی واقعی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ایسی بیوی کہاں ملے گی؟ سات جنم ڈھونڈنے پر بھی کہیں ایسا جیون ساتھی ملتا ہے؟

پھول وتی کو رخصت ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ گردھاری بہت اداس تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ حالانکہ وہ اُس کے کام سے میکے جاتی تھی مگر جب جاتی تھی گردھاری اداس ہو جاتا تھا۔ آج اتفاق سے موسم بھی ایسا تھا۔ آسمان پر اودے اودے بادل چھائے تھے۔ موسم گلابی، فضا شرابی پھر ہلکا ہلکا ترشح ہونے لگا۔ اور بارش برس کر جو تھمی ہے تو ہوا کے ایسے خوشگوار جھونکے آنے لگے۔ کہ گردھاری کے دل میں بار بار پھول وتی کی تصویر ابھرنے لگی۔ اس وقت وہ یہاں ہوتی تو سمندر کے کنارے گھومنے کو چلتے۔ دوسرے شو کا سینما دیکھتے اور آدھی رات کے وقت جنت میں مخمور جھومتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آتے.....

آج حالانکہ گھر وہی ہے مگر کس قدر سُونا سُونا سا۔ وہی خوشنما ڈرائنگ روم ہے۔ وہی ریشمی پردے ہیں۔ جھلملاتے ہوئے فانوسوں میں وہی دھیمی دھیمی روشنیاں ہیں۔ مگر پھول وتی کہاں ہے! ایک لمحے کے لیے گردھاری کا ضمیر تڑپنے لگا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے اپنے آپ کو بدل دینا چاہیئے۔ آخر ایک کار کے بغیر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ دنیا میں کروڑوں آدمی ایسے ہیں جو بغیر شیورلیٹ گاڑی کے بغیر ایک خوبصورت زندگی بسر کرتے ہیں اور پھول وتی کو اُس کے میکے نہیں بھیجے گا۔ کم از کم روپے کے لیے تو نہیں بھیجے گا۔ آج اس وقت وہ یہاں ہوتی....

وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا اور اپنے گہرے دوست شیام سندر سے اپنے دل کا دکھ بیان کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ دونوں دوست وہسکی پیتے رہے اور اداس ہوتے گئے کیونکہ موسم ہی ایسا تھا جس میں اداسی بڑی سہانی اور رومانی معلوم ہوتی۔

شیام سندر نے کہا۔ آؤ دوست کہیں باہر چلیں۔

میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ گردھاری نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ مجھے اس وقت پھول وتی یاد آ رہی ہے۔

میرے ساتھ چلو۔ شیام سندر نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلتا ہوں۔ جہاں تمہارا سارا غم غلط ہو جائے گا۔

کہاں لے چلو گے؟

ارے تم میرے ساتھ چلو تو سہی۔

نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں آج تک کسی ایسی جگہ نہیں گیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے ہائے میری پھول وتی۔

شیام سندر نے رازدارانہ لہجے میں اس سے کہا۔ ایک لڑکی کو میں جانتا ہوں اگر اُسے تم ایک نظر دیکھ لو۔ مگر گردھاری نہیں مانا۔ ناچار شیام سندر اکیلا ہی ہال سے چلا گیا کیونکہ موسم بہت گلابی تھا اور جب شیام سندر چلا گیا تو گردھاری اور بھی اداس ہو گیا۔ اب اسے ہر طرف پھول وتی نظر آنے لگی اور ہر سانس میں اس کی مہک آنے لگی اور وہ ہر لحظہ رنجیدہ اور اداس ہوتا گیا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ اس کی اداسی گہری ہو چکی تھی اور اس کی وہسکی ختم ہو چکی تھی اور اب عورت کی آغوش کے سوائے غم غلط کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے گردھاری اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اسی طرح اپنی روح کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت دیر تک وہ شہر کی گلیوں میں اس کے بدنام کوچوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اُسے تلاش تھی ایک ایسی لڑکی کی جو نئی ہو۔ نسبتاً اچھی ہو۔ خوب صورت ہو۔ جوان ہو۔ مہربان ہو، مزاج کی اچھی ہو۔ طبیعت کی عمدہ ہو۔ شرمیلی ہو گالیاں رنگتی ہو۔ سنجیدہ اور مہذب ہو۔ یعنی بیوی ہو اور بازاری بھی ہو۔ عقلمند سے عقلمند مرد بھی ایسے موقعوں پر بے وقوف ہوتا ہے۔

لیکن وہاں اُسے دیر تک اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا پڑا۔ ٹیکسی پر اب تک اس کے سولہ روپے خرچ ہو چکے تھے۔ اگر آج اس کی اپنی گاڑی ہوتی تو یہ خرچ تو نہ ہوتا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اس نے پھول وتی کو میکے بھیج دیا۔ کاڑی زندگی کے لیے یہ حد ضروری ہے۔

ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گذرتے ہوئے ایک خوبصورت باغیچے سے گھرے ہوئے دو منزلہ مکان کے سامنے رکی۔ دلال نے اس سے کہا۔ بس صاحب! دنیا میں اس سے بہتر مال کہیں نہیں ہے۔ میں آپ کو سورگ کی حد پر لے آیا ہوں آپ سیدھے اندر چلے جائیے سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی دوسری منزل پر چلے جائیے۔ دروازے پر بیل لگی ہے بٹن دبا کر انتظار کیجئے۔ وہ آپ کے لیے انتظار کر رہی ہے۔ میں نے سب بندوبست کر دیا ہے۔ صاحب سلام!

گردھاری نے ٹیکسی کو چلتا کر دیا۔ اس نے انتظام کرنے والے کو پانچ روپے کی بخششیں دی۔ اس کے بعد وہ پُر امید اور مسرور پرانی وضع کے بنگلے کے باغیچے میں داخل ہو گیا۔ باغیچے میں سے جوہی اور رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں سرایت کرنے لگی۔ اور وہ جوان رات کے اس پہلے پُر اسرار سفر کے لیے تازہ دم ہوتا گیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے پرانے پیتل کے فانوس کو دیکھا سیڑھیوں کے کنارے کنارے رو رو یہ گملے اس قسم کے شاداب پھولوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا واقعی یہ لوگ اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ چوبی تختوں والے برآمدے میں پہنچا تو اس کے دل سے پھول وتی کا ہر خیال دور ہو چکا تھا اور اب وہ ہر طرح رات کے انجانے سفر کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے خوشی سے سیٹی بجاتے ہوئے ارمانوں کو دعوت دی اور جلدی سے دروازے کا بجلی بٹن دبا دیا۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت لڑکی مسکراتے اس کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھی۔

وہ آگے بڑھتے بڑھتے یکایک اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

دروا [illegible] تھی۔

ساجھے کا مُردہ

ساڑھے چار بجے کے قریب جب بھاگو کی بیوی بھگوتی اس کے کمرے میں چائے کا پیالہ لے کر گئی تو اس نے بھاگو کو پلنگ پر مردہ پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کے قیلولے کے درمیان کسی وقت مر گیا تھا جبکہ بھگوتی اپنے کمرے میں سلائی کی مشین پر اپنا بلاؤز سینے میں مصروف تھی۔ بھاگو ایک عرصے سے دل کی بیماری میں مبتلا تھا اور ڈاکٹر اس کی حالت اچھی نہیں بتاتے تھے۔ پھر بھی اس نے اتنے برس گھسٹ گھسٹ کر گزار دیے تھے اور اس کی بیوی بھگوتی کو مطلق یقین نہ تھا کہ آج وہ یوں اچانک بھگت جائے گا۔

سب سے پہلے بھگوتی کے دل میں خیال آیا کہ وہ ایک زور کی چیخ مارے اور اپنے رونے پیٹنے سے سارے محلے میں وحشت پھیلا دے پھر یکایک اسے اس تجوری کا خیال آیا جس کی چابیاں بھاگو ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا اور کبھی اپنی بیوی کے حوالے نہ کرتا تھا۔ بھاگو کے چار بیٹے تھے دو انگلینڈ میں، دو افریقہ میں۔ بھاگو نے اپنی جمع پونجی میں سے اپنے چاروں بیٹوں کو اُن کے حصے کے ڈھائی ڈھائی لاکھ روپے دے دیے تھے اور باقی رقم لے کر بمبئی چلا آیا تھا۔ یہاں باندرے کی ایک نئی مضافاتی کالونی میں آوشا بلڈنگ میں تیرھویں سڑک پر اس نے پچیس ہزار کی مالیت کا ایک فلیٹ خرید لیا تھا اور اس میں اپنی بیوی بھگوتی کے ہمراہ رہتا تھا۔ اس کے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بیٹوں نے اپنے باپ کا یہ اقدام پسند نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا باپ اپنی بقیہ پونجی بھی اپنے بیٹوں میں بانٹ دے اور خود باری باری ہر بیٹے کے پاس رہا کرے مگر یہ بات نہ بھاگو کو پسند آئی، نہ بھگوتی کو۔ اس لیے بیٹے بھاگو سے بدظن ہو گئے اور اپنے اپنے حصے کے ڈھائی لاکھ لے کر انھوں نے صبر کر لیا اور وہاں باپ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

چند لمحوں کی خاموش کش مکش کے بعد بھگوتی نے چیخ مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے بھاگو کی جیب سے تجوری کی چابی نکال کر اپنے قبضے میں کی۔ بھاگو کی جیب سے چابی نکالتے وقت بھگوتی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیونکہ بھاگو، بھگوتی کی طرح انتہائی خسیس اور محتاط آدمی تھا اور روپے پیسے کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھگوتی کے دل میں خیال گزرا کہ چابی نکالتے وقت بھاگو کا ہاتھ حرکت میں آ جائے گا اور وہ بھگوتی کی اس جسارت پر زور کا ایک چانٹا بھگوتی کے رخسار پر رسید کرے گا۔ لیکن جب جیب سے چابی نکالتے وقت بھاگو کے ہاتھ بے حس و حرکت رہے اور جب اس چابی سے تجوری کھول کر بھگوتی نے نوٹوں کی گڈیاں گنیں اور اس وقت بھی بھاگو اپنے پلنگ سے اٹھ کر تجوری کی طرف نہ آسکا تو بھگوتی کو کامل یقین ہو گیا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔ اس نے تجوری بند کر کے چابی کس کے اپنے کمربند سے باندھ لی اور عنقریب زور کی چیخ مارنے کو تھی کہ یکایک اس کی چیخ پھر ملتوی ہو گئی کیونکہ اب بھگوتی کا خیال اپنے مردہ شوہر کے ہاتھ کی طرف گیا۔ جہاں دو بیش قیمت انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ ایک انگوٹھی نیلم کی تھی اور دوسری ہیرے کی۔ بھگوتی نے سوچا، تھوڑی دیر کے بعد جب سب محلے والے اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس وقت تو میں چیخ پیٹ میں مصروف رہوں گی۔ اس ہنگامے میں میرے لیے اپنے مردہ شوہر کی انگوٹھیوں پر نگاہ رکھنا ناممکن ہو گا۔ لہٰذا انھیں بھی اتار لیتی ہوں۔ چنانچہ بھگوتی نے

جلدی سے اپنے شوہر کی انگلیوں سے دونوں انگوٹھیاں اتار کر تجوری میں رکھ دیں۔

پھر اس نے اپنے بال کھول ڈالے، دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے اور ایک لمبی خوفناک چیخ ماری اور زور زور سے دو ہتھڑ مار کر اپنا سینہ کوٹنے لگی اور چلا چلا کر بین کرنے لگی۔ اسی وقت آس پاس کے فلیٹوں کے دروازے کھلنے لگے اور عورتیں اور مرد بھاگے بھاگے بھاگو کے فلیٹ کے اندر آنے لگے اور جب بھگوتی نے دیکھا کہ آٹھ دس مرد عورتوں کا جمگھٹا ہو گیا ہے تو وہ سب کے سامنے روتی پیٹتی اپنے فلیٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے لیے بھاگی مگر سب لوگوں نے گھیر کر روک لیا۔

بمبئی میں شادی یا موت کا ہنگامہ چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے چند منٹ تک لوگوں کے حواس پر سراسیمگی چھائی رہی۔ کچھ عرصے کے لیے لوگ جوق در جوق فلیٹ کے اندر آ کر اظہار افسوس کرتے رہے اور بھگوتی عمدہ موزائیک کے فرش پر نیم دراز حالت میں تڑپتی ہوئی بین کرتی رہی۔ لوگوں نے بھاگو کو فرش پر لٹا دیا اور اس کے جسم پر ایک چادر ڈال دی اور زیر لب افسوس کے کلمات بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ گمان کیا، یقین تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد بھگوتی کے رشتہ دار یا بھاگو کے رشتے دار یا دونوں آ گئے تھے اور بھاگو کی لاش ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس یقین کے ساتھ سب لوگ واپس اپنے اپنے فلیٹ میں چلے گئے اور کرتے بھی کیا؟ فلیٹوں کی زندگی ایسی ہوتی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ پھر یہ تو ایک نئی مضافاتی کالونی تھی۔ یہاں تو بالکل ہی کوئی کسی کو نہیں جانتا تھا اس لیے فنی ہمدردی کی اوپری سطح کھرچنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا؟

البتہ چند لوگوں کو ضرور پریشانی تھی۔ ایک تو مجھے، کیونکہ جہاں میرا کھانے کا کمرہ تھا اس کے بالکل اوپر کے کمرے میں بھاگو کی لاش رکھی تھی اور اپنے کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے مجھے بجا طور پر یہ احساس ہو رہا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

تھا گویا میں ایک لاش اپنے کندھے پر رکھ کر کھانا کھا رہا ہوں۔ مگر مجھے اس لیے بھی پریشانی تھی کیونکہ میں بمبئی میں نو وارد تھا۔ ورنہ بمبئی کے فلیٹوں کی زندگی میں یہ سب کچھ ممکن تھا۔ کیونکہ جہاں میرے سونے کا کمرہ تھا اس کے بالکل اوپر بغل والے فلیٹ کا باتھ روم ہے۔ اکثر اوقات پلنگ پر لیٹے لیٹے اچانک فلش کی آواز سے میں چونک کر بیدار ہو جاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صاحب میرے سر پر بیٹھے رفع حاجت میں مصروف ہیں۔ حالانکہ مجھے شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ آخر میرا باتھ روم بھی تو کسی کے بیڈ روم کے اوپر ہوگا۔ اس لیے مجھے اس قسم کی باتوں کا عادی ہو جانا چاہیئے۔ اب ایک لاش میرے کھانے کے کمرے کے بالکل اوپر پڑی ہے۔ تو پڑی رہے، مجھے کیا؟ بھاگو کے رشتے دار آئیں گے اور اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔ جب تک میں ریفریجیٹر کھول کر برف میں لگے ہوئے دو آم الفانزو کے کیوں نہ کھاؤں؟ مجھے زور کی بھوک لگی ہے اور میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی کے مرنے کی خبر سنتے ہی مجھے زور کی بھوک لگ آتی ہے۔ شاید یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جو زور سے ابھر کر بھوک کی صورت میں نمودار ہوتی ہے! کیا معلوم؟ میں الفانزو کھاتے کھاتے اپنے مزاج کی اس افتاد پر غور کرنے لگا۔

میرے علاوہ مکن بھائی گیسٹ کو بھی پریشانی تھی کیونکہ اس کے فلیٹ کا دروازہ بھاگو کے فلیٹ کے بالکل سامنے کھلتا تھا اور آتے جاتے، دروازہ کھلتے، اس کے بیوی بچے اپنے فلیٹ سے بھاگو کے ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑی ہوئی لاش دیکھ سکتے تھے، محض چند قدم کے فاصلے پر۔ لاش پر سے چادر سرک گئی تھی اور بھاگو کے کھچڑی بال اور اس کے زرد کان کی ایک لو نظر آ رہی تھی اور اسے دیکھ کر مکن بھائی کے بچوں کے جسم میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑتی تھی۔ اور مکن بھائی کی بیوی شاردا کو ابکائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ لاش ایک طرح موت کی مسلسل یاد دہانی ہوتی ہے اور اس یاد دہانی کو کون پسند کر سکتا ہے؟ جتنی جلدی اس سے

چھٹکارا مل جائے اچھا ہے۔

شام کے سات بجے کے قریب بھگونتی کا ایک ماموں آیا۔ بھگونتی کے ماموں کی شکل پیلے رنگ کے ایک امرود سے ملتی جلتی تھی۔ ماموں بھی دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ اس لیے وہ بھی لاش کے قریب زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اظہار افسوس کرنے کے بعد اس نے بھگونتی سے اس کے بیٹوں کا ایڈریس لیا۔ انہیں ٹیلی گرام بھجوانے کا وعدہ کیا۔ احمد آباد میں بھاگو کے کسی رشتے دار کو بھی ٹیلی فون کرنے کا وعدہ کیا اور بھگونتی کے پاس اپنا ایک آدمی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم یہ سمجھے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنے گیا ہے مگر جب رات کے دس بج گئے اور بھگونتی کا ماموں نہیں لوٹا تو ہم نے اس کے آدمی سے پوچھا۔ جو لاش کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ آدمی افسوس سے سر ہلا کر بولا "ہم کو کچھ مالم نہیں ہے، مردے کا کیا ہوگا۔ ہم کو سیٹھ ادھر بٹھا کے بول گیا ہے۔ ادھر تم اکھا رات بیٹھے گا۔ مردے کا جو کوئی سگے والا آئے گا۔ اس کو مردے کا منہ دکھائے گا۔ پھر چادر ڈال دے گا۔ ہم کو اس کام کے واسطے دس روپیہ سیٹھ دے گیا ہے۔ صبح چھ بجے ہم چلا جائے گا۔"

"تو گویا آج رات بھر یہ لاش اس بلڈنگ میں پڑی رہے گی؟" مکن بھائی نے اس سے پوچھا۔

"ہم کو کیا مالم؟" وہ آدمی خفا ہو کر بولا۔ "ہم کیا مردے کا سگا والا ہے؟ ہم دس روپیہ رات کا لیتا ہے جو آدمی آتا ہے اس کو مردے کا منہ دکھاتا ہے۔ تم کو دیکھنا ہو تو دیکھو، جاستی بات مت کرو۔"

صبح چھ بجے وہ چلا گیا۔ ہم نے اسے بہت روکا مگر وہ نہیں رکا۔ ہم نے اس سے بھگونتی کے ماموں کا پتہ مانگا اس نے نہیں دیا۔ بولا "ہم کو نہیں مالوم، سیٹھ نے دکان پہ ٹیلی فون کر کے ہم کو منگایا تھا۔ اب ہم جاتا ہے۔"

"لیکن کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"دوسرے مردے کے پاس!" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

رات تو کسی طرح گزر گئی لیکن اب یہ دن کسی طرح نہ گزر سکتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اگر مُردہ کو جلد ٹھکانے نہ لگایا گیا تو لاش سڑنے لگے گی۔ اس لیے جب دوسرے دن صبح کے دس بج گئے اور بھگوتی یا بھارگو کا کوئی رشتے دار لاش اٹھانے نہیں آیا تو ہم سب لوگ پریشان ہونے لگے اور بلڈنگ کے لوگ بھارگو کے فلیٹ کے باہر اکٹھا ہونے لگے۔

بھگوتی نے بتایا کہ اس کا ماموں رات سے اب تک نہیں آیا تھا۔ ہم نے بھگوتی سے ٹیلی فون نمبر لے کر اُسے ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ نہیں آ سکتا۔ دو لڑکے انگلینڈ میں تھے وہ نہیں آ سکتے تھے۔ احمد آباد میں جو رشتے دار ہے اس کے آنے کی کوئی امید نہیں ہے، کیونکہ بھگوتی کے بیان کے مطابق کچھ روپے پیسے کا جھگڑا تھا۔

دوسرے دن صبح یکایک، بلڈنگ والوں پر انکشاف ہوا کہ یہ میت انہی کو سنبھالنی پڑے گی۔ اس پر سب لوگ پہلے تو پریشان سے ہوتے پھر ایک دم سب کی بشاشت عود کر آئی اور سب لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر میت سنبھالنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ بے چاری بھگوتی تو عورت ذات تھی اسے نہ تو کچھ معلوم تھا نہ اس سے کوئی کچھ پوچھ سکتا تھا۔ بے چاری کا سہاگ لُٹ چکا تھا۔ رات بھر روتے روتے اُس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور سُرخ انگارا سی دہکتی تھیں۔

چنانچہ یہ کام سرانجام دینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا سیکرٹری مجھے منتخب کیا گیا اور خزانچی شرف الدین بوہرہ کو، جو ہماری بلڈنگ کا سب سے امیر آدمی تھا۔ تین آدمی ہماری امداد کے لیے اس کمیٹی میں شامل کیے گئے۔ پنڈت دیا رام پراشر کہ وہ بڈھے مذہبی اور تجربہ کار برہمن تھے۔ اب تک کئی درجن میتوں کا بھگتان کر چکے تھے۔ ماسٹر بھولا ناتھ کہ ان کے گھر میں ٹیلیفون تھا اور رنگن بھائی کیمسٹ کہ لاش کو جلد سے جلد ٹھکانے لگانے میں اُن کی دل چسپی سب سے زیادہ تھی کیونکہ ان کا فلیٹ بھارگو کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ مجھے اس لیے چنا گیا کہ مجھے ہر مجلس میں سیکرٹری چن لیا جاتا ہے

کیونکہ میرے پاس ایک ایسی مشفقانہ سی مسکراہٹ ہے جو ہمیشہ موجود رہتی ہے جس میں ہر کمیٹی ممبر اپنے ڈھب کا مطلب لے لیتا ہے۔ ہر کامیاب سیکرٹری کے لیے ضروری ہے کہ وہ مونا لیزا کی طرح مسکرا سکے۔

مگر مُردے ٹھکانے لگانے کے معاملے میں میں بالکل کورا تھا۔ اس لیے پنڈت دیا رام پراشر نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے اور اس سے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لینا چاہیے۔ ورنہ مردے کو کسی طرح جلایا نہیں جا سکتا۔"

"مرحوم کس ڈاکٹر کا علاج کرتے تھے؟" میں نے بھگوتی سے بار بار پوچھا مگر وہ بے چاری رونے دھونے میں اس قدر مصروف تھی کہ ٹھیک سے کچھ نہ بتا سکی۔ بس اتنا پتہ چلا کہ مرحوم نے چند روز قبل اپنا علاج بند کر دیا تھا اور چند روز قبل وہ ڈاکٹر شابانی کے زیرِ علاج تھے۔

میں شرف الدین بوہرے کی گاڑی میں بیٹھ کر ڈاکٹر شابانی کے مطب میں گیا تو بھارگو کا نام سُنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ "میں ہرگز ہرگز اس کے لیے کوئی میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں دوں گا۔ میرے تین ماہ کا بل اس نے ادا نہیں کیا ہے ڈھائی سو روپے کا۔"

"آپ کے پیسے ادا ہو جائیں گے۔" شرف الدین بوہرہ کامل اطمینان سے بولا۔ "مرحوم ایک امیر آدمی تھا۔"

"ہم ابھی مرحوم کی بیوی یعنی بیوہ سے آپ کے پیسے لا کے دیے دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پہلے میرا پچھلا تین ماہ کا بل کوئی ادا کرے۔ اس کے بعد سرٹیفکیٹ مانگنے آئے۔"

ہم لوگ گاڑی میں واپس آئے۔ میں نے اندر جا کر بھگوتی سے استفسار کیا تو بے چاری کراہتی ہوئی رونے لگی۔ "ہائے میں غریب بیوہ۔ مجھے ابھی سے لوگ لوٹنے لگے مجھے تو کچھ معلوم نہیں، ہائے میرا سہاگ لُٹ گیا اور لوگ مجھ سے پیسے مانگتے ہیں۔"

آدھ گھنٹے تک وہ ایسے ہی ننگے فرش پر جھکی بین کرتی رہی۔ مگر مجبوری

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

سے اس نے پیسے نکال کر دے دیے۔ ناچار بلڈنگ والوں نے چندہ کیا اور ڈاکٹر شابانی کو بلا بھیجا اور ڈاکٹر شابانی کو بھارگو کے فلیٹ میں بلا لائے۔ ڈاکٹر شابانی نے بھارگو کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "بلاشبہ مرحوم کی موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔ میں اس امر کا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں۔"

میں بہت خوش ہوا۔ مارے خوشی کے مگن بھائی کی آنکھیں بھی کھل گئیں مگر مہاشے بھولا ناتھ کا منہ لٹک گیا۔ بولے "یہ سرٹیفکیٹ نہیں چلے گا۔"

"کیوں نہیں چلے گا؟" پنڈت دیا رام پراشر، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ٹھیٹ سناتنی تھے اور مہاشے بھولا ناتھ پکے آریہ سماجی، دونوں میں ٹھنی رہتی تھی، مگر دھیمی دھیمی۔

مہاشے بھولا ناتھ بولے "ادھر اگر سرٹیفکیٹ میں ہارٹ فیلیور لکھ دیا تو پولیس مردہ جلانے نہیں دیتی۔ اس مردے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔"

"ہمارے سرگودھا میں تو نہیں ہوتا۔" پنڈت دیا رام پراشر نے حیرت سے کہا۔

"یہ سرگودھا نہیں، بمبئی ہے۔" مہاشے بھولا ناتھ نے فخریہ لہجے میں یوں کہا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "وڈ اپ!"

"ٹھیک کہتا ہے، مہاشے جی! ٹھیک کہتا ہے۔" شرف الدین بوہرہ بولا۔

"ادھر بمبئی کا رول یہی ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جھوٹا سرٹیفکیٹ دینا ہوگا۔" ڈاکٹر شابانی بولا۔

"جھوٹا کیوں؟" میں نے پوچھا "بھارگو مر چکا ہے۔ اس کی لاش تمہارے سامنے ہے۔"

"مگر مجھے مرض تو غلط لکھنا پڑے گا۔" ڈاکٹر شابانی بولا "تاکہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ ہو سکے۔"

"ہاں! یہ تو ہے!" مگن بھائی بولا۔

"تو اس کے لیے فیس ہوگی۔" ڈاکٹر شابانی نے اعلان کیا "پندرہ روپے۔"

میں نے اندر جا کر بھگوتی سے پندرہ روپے مانگے مگر وہ منہ سے کچھ نہ

بولی۔ سسک سسک کر، کراہ کراہ کر روتی رہی۔ اس نے مجھے پندرہ روپے نہیں دیے تو میں نے اپنی جیب سے نکال کے دیے تب ڈاکٹر شابانی نے سرٹیفکیٹ دیا تو مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا "مردے کو جلایا کہاں جائے گا؟"

میں نے جواب دیا "شمشان گھاٹ میں۔"

"ہاں ہاں شمشان گھاٹ، مگر کس شمشان گھاٹ میں؟"

مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا "سب اچھا شمشان تو میرین ڈرائیو پر ہے۔ شہر کے تمام بڑے بڑے اور امیر آدمی وہیں جلائے جاتے ہیں۔ بھگوتی کا کیا ارادہ ہے؟"

جب بھگوتی سے پوچھا گیا تو وہ زور زور سے رونے لگی۔

"ہائے جب میرا سہاگ ہی لٹ گیا تو مجھے مردے کی کیا تمیز؟ ارے کہیں بھی جلا دو اور ہو سکے تو مجھے بھی اس کے ساتھ جلا دو۔"

مہاشے بھولا ناتھ نے میرین ڈرائیو کے شمشان گھاٹ پر ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ گھاٹ پر ہاؤس فل ہے۔ رات تک کے لیے لاشوں کی بکنگ ہو چکی ہے۔ ایک جگہ بھی خالی نہیں ہے۔ مجبور ہو کر ہم لوگ سانتا کروز کے شمشان گھاٹ پر گئے۔ شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ سانتا کروز کا شمشان گھاٹ بھی فل ہے۔ کل صبح تک ایک سیٹ نہیں مل سکتی۔

"تم ہندوؤں کے یہاں بہت لفڑا ہے جلانے کا۔" شرف الدین بوہرہ نے بڑی بیزاری سے اعلان کیا۔ گاڑی میں شرف الدین کے باقی سب ہندو تھے اس لیے سب کا خون کھول گیا مگر سب چپ رہے کیونکہ گاڑی شرف الدین کی تھی۔

سانتا کروز سے ہم لوگ واپس باندرے کے اس شمشان کی طرف گئے جو ریلوے اسٹیشن کے یارڈ میں واقع ہے۔ اس شمشان گھاٹ تک پہنچنے کے لیے بیچ میں ریلوے کے دو کراسنگ آتے ہیں جن کے دروازے اکثر ریلوے والوں کی اپنی ضرورت کے مطابق کھلتے ہیں اور بند رہتے ہیں۔ چنانچہ سانتا کروز سے باندرے کے اسٹیشن یارڈ تک پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اور بیٹ گیا۔ شمشان گھاٹ کا مہتمم بڑی مشکل سے مانا: "آج بہت رش ہے"۔ وہ سر ہلا کر بولا۔

"کسی طرح سے ہمارا مردہ لے لو، رات سے سڑ رہا ہے۔" میں نے اس کی منت سماجت کی۔

"چار لاشیں پہلے ہی ہیں اور دو جل رہی ہیں"۔ مہتمم میری طرف خشونت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "جگہ کدھر ہے؟ دیکھتے نہیں ہو!"

پنڈت دیا رام پراشر اسے ایک کونے میں لے گئے۔ چند منٹ تک اس سے کھسر پھسر کرتے رہے آخر وہ رام ہو گیا۔ پنڈت دیا رام پراشر مہتمم کے ساتھ ہمارے گروپ میں واپس آئے تو کامیابی سے ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ بولے: "ہو گیا کام!"

مہتمم نے سر ہلا کر کہا "لے آؤ۔ مگر دو گھنٹے بعد آنا۔ اس سے پہلے لاؤ گے تو اندر گھسنے نہیں دوں گا"۔

جب ہم لوگ سب طے کر کے واپس شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھے تو پنڈت دیا رام پراشر نے بتایا کہ مہتمم اپنے شمشان گھاٹ کا ٹھیلہ بھیج رہا ہے، مردہ اٹھانے کے لیے"۔

"کیسا ٹھیلا؟" میں نے پوچھا۔

"چار پہیوں والا ٹھیلا ہوتا ہے جس پہ مردہ رکھ کر لے جاتے ہیں!"

"مردوں کو تو کندھوں پہ لے جاتے ہیں نا!" میں نے پوچھا۔

"وہ سرگودھا میں لے جاتے ہوں گے"۔ مہاتمے بھولا ناتھ نے اعلان کیا: "بمبئی میں نہیں لے جاتے"۔ اور فخریہ انداز سے پنڈت دیا رام پراشر کی طرف دیکھا۔

پنڈت دیا رام پراشر نے جل کر کہا: "اجی کیسا تمہارا شہر بمبئی نہ کرم کا پتہ نہ لوک لاج کی فکر۔ شمشان گھاٹ والے کو چار روپے دیئے ہیں جب اس نے ٹھیلا بھیجنے کا وعدہ کیا ہے"۔

مہاتمے بھولا ناتھ کا چہرہ اتر گیا۔ پنڈت دیا رام پراشر نے ٹھیلے کے چار روپے دے کر گویا اسے چت مار دی تھی مگر وہ بھی اس کا بدلہ لے کر رہے گا ذرا ٹھہر جا!

ہم لوگ پھر واپس اپنی بلڈنگ میں پہنچے۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا اور مردے کی سڑاند سے ساری بلڈنگ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی اور مرد عورتیں، بچے گھبرا کر اپنے اپنے فلیٹوں سے باہر نکل آئے تھے اور بلڈنگ کے احاطے میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے اور انتہائی پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ہماری گاڑی احاطے میں آتی دیکھ کر سب طرف بھاگے اور ہم پر متوحش نگاہیں ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے "کیا ہوا؟"

"کس شمشان گھاٹ میں جگہ ملی؟"

"مردہ کب جائے گا؟"

"مردہ سڑنے لگا ہے!"

"مردے کا پیٹ پھول رہا ہے"۔

"بڑا واہیات حادثہ ہے صاحب! میں تو سمجھتا ہوں ایسے میں جب متوفی کا کوئی رشتے دار بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ ہمیں سیدھے پولیس کو ٹیلی فون کر کے مردہ ان کے حوالے کر دینا چاہیئے"۔

"نہیں تو میونسپلٹی کو فون کر کے مردہ اُن کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ عجب مصیبت ہے۔ مرے کوئی بھگتیں ہم"۔

سب لوگ بولاتے ہوئے تھے اور زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر بات کر رہے تھے اور وہ لوگ بہت برانگیختہ معلوم ہوتے تھے مگر جب ہم نے بتایا کہ شمشان گھاٹ ریزرو ہو گیا ہے اور مردہ جلانے کا انتظام ہو گیا تو سب کی جان میں جان آئی"۔

"جب تک ٹھیلے والا آتا ہے"۔ پنڈت دیا رام پراشر نے کہا: "ہم لوگ باقی چیزوں کا انتظام کر لیں"۔

"اب اور کیا چاہیئے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا: "مردہ ٹھیلے پر لاد کر گھاٹ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

پڑے جائیں گے اور جلا دیں گے۔"

مہاشے بھولا ناتھ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کسی بھولے بچے کی حماقت پر مسکرا رہے ہوں۔ پچکارنے کے انداز میں بولے "بیٹا! ابھی جلانے کی منزل بہت دور ہے۔"

"ابھی تو پھول آئیں گے ارتھی کے لیے۔" پنڈت پراشر انتہائی شفقت سے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولے۔

"اور گھی آئے گا جلانے کے لیے۔" مہاشے بھولا ناتھ مجھے جلاتے ہوئے بولے۔

"اور کوری چادر آئے گی مردے پر ڈالنے کے لیے۔" مہاشے بھولا ناتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"اور پھر پھل، بتاشے، بادام، چھوارے اور کچھ نقدی چاہیے" پنڈت پراشر بولے۔

"کا ہے کے لیے؟"

"جب ارتھی چلے گی تو اس پر پیسے وارے جائیں گے۔"

"اور ایک کوری مٹکی آئے گی، کمہار سے۔ وہ شمشان گھاٹ کے باہر توڑی جائے گی۔"

"اور ان سب کاموں کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟" میں نے پوچھا "میں ہر فلیٹ والے سے دس روپے چندہ لے چکا ہوں۔"

سب لوگ خاموشی سے میرا منہ تکنے لگے، جیسے پُر امید انداز میں گویا مجھ سے کہہ رہے ہوں، ایک مرتبہ پھر کوشش کر کے دیکھو۔

"اچھا کرتا ہوں!" یہ کہہ کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بھاگو کے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔

اندر سخت بدبو تھی۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر مُردہ اکیلا پڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں چند عورتوں نے بھاگو کی بیوی کو گھیر رکھا تھا اور اسے زبردستی دودھ پلا رہی تھیں۔ وہ سسک سسک کر انکار کر رہی تھی۔ نہیں، میں نہیں

پیوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر دودھ نہیں پیوں گی، ہرگز نہیں پیوں گی۔"

"کل دوپہر سے بھوکی ہے بے چاری!" چاچی گوپال دلوی نے پنڈت دیا رام پراشر کی بیوی سے کہا۔

چنانچہ دو عورتوں نے مل کر بے چاری بھگوتی کی ٹانگیں پکڑ لیں —— ایک نے ایک بازو، دوسری نے دوسرا بازو۔ تیسری نے آگے بڑھ کر دودھ کا گلاس بھگوتی کے منہ سے لگا دیا۔ بھگوتی بے چاری ناں ناں کرتی رہی اور دودھ پیتی رہی۔ سوا سیر کا گلاس تھا پنجابی لسی والا۔ تھوڑی دیر میں گلاس خالی ہو گیا۔

جب میں نے اندر آ کر سب چیزیں گنائیں جو بازار سے آئیں گی جن کے لیے روپوں کی شدید ضرورت تھی تو بھگوتی نے پھر زور زور سے رونا شروع کر دیا: "ہائے میں تو لُٹ گئی، برباد ہو گئی۔ میرا تو یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی بیٹا ہوتا تو سب کچھ سنبھال لیتا۔ اب میں کس کے پاس جاؤں؟ کس سے پیسے مانگوں؟ ارے مرنے والے اپنے ساتھ مجھے بھی کیوں نہ لے گئے۔"

میں سر جھکا کر فلیٹ کے باہر چلا آیا۔

مجھے اُداسی سے چلتا دیکھ کر ایک صاحب جو غالباً قریب کی کسی بلڈنگ سے افسوس کرنے کے لیے آ رہے تھے، اپنی لمبی تھوتھنی لٹکائے میری طرف بڑھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش لا کر بولے: "بڑا افسوس ہے آپ کا باپ مر گیا۔"

"ارے وہ میرا باپ نہیں تھا حرامی!" میں نے گرج کر کہا "وہ بھاگو تھا بھاگو، میرا ہمسایہ۔" میں نے زور سے چلا کر کہا: "کمبخت بھاگو جب تک زندہ رہا پکے راگ گا گا کر میرا وقت برباد کرتا رہا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی کے گلے میں پاپڑ پھنس جائے۔ پاپڑ سمجھتے ہو پاپڑ؟ کم بخت مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

میں غم اور غصے میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ وہ آدمی شرمندہ ہو کر وہاں سے ٹل گیا۔

اتنے میں شرف الدین بوہرہ وہاں آ گیا اور بولا: "بلڈنگ والوں نے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

پانچ پانچ روپے کا مزید چندہ دیا ہے۔ پنڈت دیا رام پراشر اور مہاشے بھولا ناتھ باقی چیزوں کا انتظام کرنے میں مصروف ہیں۔ تم اس قدر گھبراتے کیوں ہو؟"

تین بجے تک سب سامان آ گیا ٹھیلے والا بھی دو بڑے چار پہیوں والا ٹھیلا لے کر پہنچ گیا۔ ارتھی کے پھول تو آ گئے تھے۔ مگر ارتھی سجانے کے لیے بانس کی کھپچیاں سب بھول گئے تھے۔ جلدی سے مگن بھائی کمیسٹ اپنی گاڑی لے کر اندھیری بھاگا اور بانس کی کھپچیاں لے کر آیا جو ٹھیلے کے اردگرد چاروں طرف باندھی گئیں پھر ان پر رنگین کاغذ منڈھنے کے لیے گوند کی ضرورت پڑی اور جب گوند آ گیا تو کسی کو خیال آیا کہ مُردے کو باندھنے کی رسّیاں موجود نہیں ہیں۔ اس میں خاصی بھاگ دوڑ ہوئی مگر اب خیریت یہ تھی کہ کمیٹی کے علاوہ بلڈنگ کا ہر فرد بیشتر مُردے کے سلسلے میں کسی نہ کسی کام میں جٹا ہوا تھا۔ بھاگ بھاگ کر اور ایسی تن دہی سے کام کر رہا تھا کہ اگر یہی خلوص اور جذبہ ملکی منصوبے میں صرف ہو تو پنج سالہ پلان سال ہی میں مکمل ہو جایا کرے۔ ہم سب لوگ عجیب بحرانی کیفیت میں گرفتار تھے کیونکہ وقت گزر رہا تھا اور مُردہ پھول رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے مُردے کو نہلایا گیا۔ اس احتیاط سے کسی مغل شہزادی کو بھی نہ نہلایا گیا ہوگا کیونکہ ہر لحاظ سے یہی ڈر غالب تھا کہیں اس کا پیٹ نہ پھٹ جائے جو اس دوران میں برابر پھولتا جا رہا تھا۔

نہلانے کے بعد جب ہم لوگ میّت فلیٹ سے باہر نکالنے لگے تو بھگوتی نے زور کی ایک پچھاڑ کھائی اور بھاڑ گو کو اس کے ساتھ ستی ہو جانے کی دھمکی دی جس کا مُردے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بہت سی عورتیں آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھیں اور جن عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ شدید بدبو کی وجہ سے تھے۔

دو آدمیوں نے مُردے کو سر کی طرف سے پکڑا دو آدمیوں نے ٹانگوں کی طرف سے۔ دو آدمیوں نے بیچ کے دھڑ کو سہارا دیا۔ لاش ہوئے چلے باہر نکلنے لگی تو پنڈت دیا رام پراشر بولے "پہلے سر باہر نکلے گا۔"

"نہیں، پہلے ٹانگیں جائیں گی۔" مہاشے بھولا ناتھ نے اصرار کیا۔

گھر سے نکلتے وقت ہمیشہ میّت کا سر آگے ہوتا ہے۔"

"بالکل غلط" مہاشے بھولا ناتھ بڑی سختی سے بولے "سر آگے ہوتے ہیں"

"منش کی آتما اس کے سر میں ہوتی ہے۔" پراشر نے شاستر کا حوالہ دیا۔ لیکن سورگ تک پہنچنے کے لیے تو پیدل ہی جانا پڑے گا، پاؤں سے۔"

مہاشے بھولا ناتھ بولے۔

"تم مجھے سمجھاتے ہو؟" پنڈت پراشر غصّے سے چلا کر بولے۔ "بہتر برس کی میری عمر ہو گئی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی — میرا مطلب ہے گھاٹ گھاٹ کا مُردہ جلا چکا ہوں۔ تم مجھے انتم سنسکار کے بارے میں کیا بتا سکتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ اگر اس گھر سے مردہ نکلے گا تو سب سے پہلے اس کا سر نکلے گا۔" پنڈت پراشر گرج کر بولے۔

"نہیں! اس کی ٹانگیں نکلیں گی!" مہاشے بھولا ناتھ اپنے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بولے۔

"لڑتے کیوں ہو؟" شرف الدین بوہرہ بولا۔ "ٹاس کر لو۔"

لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد قرار پایا کہ ڈرائنگ روم سے نکالتے وقت تو مُردے کی ٹانگیں آگے رہیں گی لیکن کمیٹی دور سے زینہ اترتے ہوئے سر آگے کر دیا جائے گا۔ اس سے زینہ اترنے میں آسانی رہے گی۔ اس مفاہمت پہ دونوں فریق راضی ہو گئے اور مُردہ فلیٹ سے نکل کر زینے پر آ گیا۔

مگر زینہ اترنے میں بڑی دقّت تھی کیونکہ بمبئی کے فلیٹوں کے زینے مُردوں کے لیے نہیں بنائے گئے تھے، زندوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایک وقت ایک ہی آدمی ان پر چل سکتا ہے۔ یہاں مُردے کو چھ آدمی سنبھالے ہوئے تھے۔ دو سر کی طرف سے دو ٹانگوں کی طرف سے اور دو دھڑ سے اور زینے پر صرف ایک آدمی کے گزرنے کی جگہ تھی اور وہ بھی جب کہ وہ خود زندہ ہو اور اپنے پاؤں سے چل رہا ہو۔ اس لیے اب کیا ہو؟"

"بڑی مصیبت ہے۔" بدری پرشاد پائلٹ بولا۔ "میرے خیال میں تو ارتھی اولڈ فیشن ہو چکی ہے۔ اب تو مُردے کو سر، دھڑ، ٹانگیں اور پاؤں

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

سے الگ الگ کاٹ کے بوری میں بھر کے سمندر میں ڈال دینا چاہیئے، یہ طریقہ سب سے سائنٹیفک ہے۔"

میں نے کہا "بہت سے لوگ بمبئی میں یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا نام دوسرا ہوتا ہے۔"

"کیا؟"

"قاتل"

میرا جواب سن کر پراشر بالکل چپ ہو گیا اور ہم لوگ کسی نہ کسی طرح سے لاش زینے سے اتار کے نیچے احاطے میں لے آئے اور اسے ٹھیلے پر باندھ دیا اوپر سے ریشمی چادر ڈال دی اور ارتھی پھولوں سے سجا دی اور "رام نام ست ہے" کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے ٹھیلا چلاتے ہوئے سڑک پر بڑھ گئے کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی اور ہمارے پاس ارتھی پر ڈالنے کے لیے پیسے یا دھن نہیں تھے۔ پھر بھی جو تھے وہ ہم جگہ جگہ راستے میں مٹھی بھر بھر کر ڈالتے جاتے تھے۔ انہیں لوٹنے کے لیے لڑکوں کا ایک جم غفیر ارتھی کے ساتھ ہو لیا۔ ایک دو نہیں دس دس لڑکے پیچھے پڑے تھے۔ کئی بچوں کو چوٹیں آئیں مگر ان میں جو ثابت قدم تھے انھوں نے آج شام کے پکچر کے پیسے بنا لیے اور شمی کپور کی فلم "جنگلی" دیکھنے کے لیے آدھے راستے ہی سے لوٹ گئے۔

راستے میں ریلوے کا ایک پھاٹک بند ملا اور بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد بھی جب نہیں کھلا تو پھاٹک والے کی مٹھی گرم کرنے کے بعد کھلوایا گیا اور ارتھی آگے بڑھائی گئی۔ شمشان گھاٹ کے باہر ارتھی روک کر کوری مٹکی سے جس میں پانی بھرا ہوا تھا، پانی ارتھی کے چاروں طرف گرا کر مٹکی توڑ دی گئی اور ٹھیلا شمشان گھاٹ کے اندر دھکیل دیا گیا۔

اس شمشان گھاٹ میں چھ لاشیں جلانے کی جگہ تھی۔ چھ بڑے بڑے انگیٹھے تھے۔ آدمی کے قد کے برابر جن کے اردگرد لوہے کے پول کھڑے تھے اور ان کے نیچے لوہے یا کنکریٹ کے سپورٹ تھے تاکہ جلتے وقت لکڑیاں ادھر ادھر نہ بکھر جائیں اور لاش کم سے کم لکڑیوں کے سہارے جل سکے۔

"کتنی لکڑیاں درکار ہوں گی؟" مہاشے بھولا ناتھ نے شمشان گھاٹ کے مہتمم سے پوچھا۔

مہتمم نے لاش اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد شکایتاً کہا "یہ تو بہت موٹا ہے۔"

"کیا مطلب؟" مکن بھائی کیمسٹ غرایا کیونکہ وہ خود بھی بہت موٹا تھا۔

"مطلب یہ کہ مردہ موٹا ہے۔" مہتمم بڑی ڈھٹائی اور بے زاری سے بولا "ایک کھنڈی لکڑی میں ایک مردہ جلتا ہے مگر یہ مردہ ایک کھنڈی میں نہیں جلے گا۔"

"ایک کھنڈی لکڑی ہوتی کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چار سو کلو" مہتمم نے کہا۔

"چار سو کلو لکڑی کے پیسے کتنے ہوں گے؟" پراشر نے پوچھا۔

"۳۲ روپے۔"

"رام رام!" پراشر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "ہمارے سرگودھے میں تو سات روپے کی لکڑی کافی ہوتی تھی۔"

"یہ سرگودھا نہیں ہے، بمبئی ہے!" مہاشے بھولا ناتھ نے بڑے فخر سے پراشر کو بتایا۔

پراشر گھبرا کر پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا جس کی شاخوں پر بہت سے گدھ بیٹھے تھے۔ لاش انگیٹھے کے باہر رکھی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا "میرے پاس تو بمشکل سے ایک کھنڈی کے پیسے ہوں گے۔"

"ایک کھنڈی کافی ہو گی جی۔" مہاشے بھولا ناتھ بولے۔ "بیچارے گو کو ایک کھنڈی میں جلنا پڑے گا۔ ہم نے بہت کچھ کر دیا ہے اس کے لیے بس! ایک کھنڈی کافی ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" مہتمم نہایت بے زاری سے بولا۔ "ہم ایک کھنڈی لکڑی دے کر مردے کو آگ لگاتا ہے۔ اگر مردہ نہیں جلا اور پورا نہیں جلا، آدھا ہی جلا تو ہم مردے کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔"

"ایسے کیسے چھوڑ دے گا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اور کیا کرے گا۔ ابھی دو دن کا بات ہے ادھر ایک گریب بڈھا آیا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اپنے مرد کا مُردہ لے کر۔ ہم مُردہ جلایا۔ مُردہ آدھا جلا تھی کہ مونسون آگیا۔ بارش میں لکڑی بجھ گیا۔ مُردہ آدھا جلا آدھا باقی رہا۔ بڈھی کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ وہ ادھر دن بھر رگھڑتا رہا۔ رات کے سمے ایک رحم دل لاش والا آیا۔ اس نے اپنے سنگے والے مُردے کے سنگ اُس بڈھی کے مُردے کا پیسہ بھی دیا تو مردہ جلا۔ اور یہ مُردہ بہت موٹا ہے۔"

"اچھا تو تم دو کھنڈی کا پیسہ لے لو مگر وعدہ کرو کہ مردہ ٹھیک سے جل جائے گا۔" شرف الدین بوہرہ نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ارے دو کھنڈی لکڑی میں تو ایسا جلے گا کہ ہڈی تک سرمہ ہو جائے گی۔" مہتم لکڑی تولنے کا بڑا ترازو ٹھیک کرنے لگا۔

فقط

شام کے چھ بجے تھکے ہارے جب ہم شمشان گھاٹ سے لوٹے تو بلڈنگ کی عورتوں نے بتایا کہ تین دن کے بعد چوتھا ہوگا اور چوتھے کا خرچا الگ سے ہوگا۔

یہ خبر سن کر میں نے اسی وقت میت کمیٹی کے سیکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا۔"

پاگل پاگل

شریف اپنی محبوبہ نازلی کے ساتھ سادھو واسوانی پارک میں بیٹھا تھا۔ یہ پارک باندرہ بس اسٹینڈ کے بالکل قریب اور البرٹ پیٹرول پمپ کے سامنے واقع ہے۔ کوئی خاص آڑ کی جگہ نہیں ہے۔ مگر شام کا وقت تھا اور یہاں نیم کے دو گھنے پیڑ ہیں اور اشوک کے پیڑوں کی ایک لمبی سی قطار ہے جو آج سے دس برس بعد محبت کے ماروں کے لیے خاصی آڑ پیدا کر دے گی۔ وہ وقت آنے تک یہاں ہاتھ میں ہاتھ دیے تو بیٹھا ہی جا سکتا ہے اور کچھ نہیں تو پلکوں کی گھنی آڑ میں بہت سی باتیں کہی اور سنی جا سکتی ہیں۔

مگر شریف اور نازلی کے یہاں بیٹھنے کی وجہ ایک اور بھی۔ نازلی کا مکان اس پارک کے بالکل سامنے تھا۔ یہاں سے سامنے کی بالکونی صاف نظر آتی تھی جس پہ کھڑی ہو کر نازلی کی چھوٹی بہن آسیہ نازلی پر خطرے سے اشارہ کر کے آگاہ کر سکتی تھی۔ نازلی کی باندرہ لوکل ٹرین اسٹیشن کے برابر کی گلی میں فرش پر بیٹھنے والی سبزی بھاجی بیچنے والیوں سے سبزی خریدنے گئی تھی۔ شام کے وقت سبزی بھاجی سستی ملتی ہے سبزی والیاں اس وقت سبزی کا ٹوکرا کسی قیمت پر خالی کر کے گھر جانے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کچھ بھاؤ تاؤ ہو جاتا ہے، کچھ آپس کے سکھ دکھ کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ خریدنے والیوں اور بیچنے والیوں کے درمیان وقتی طور پر مشورے اور محبت کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے کچھ گھر کی باتیں، کچھ میکے سسرال کی باتیں، کچھ بچیوں کی باتیں۔ کدو، بینگن اور بھنڈی کے ساتھ شوہر بھی ترازو میں تلتا رہتا ہے اور ہمیشہ کم وزن ثابت ہوتا ہے مردولا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کی خریداری بھی کوئی خریداری ہے، تھیلا کھولا، بھاجی کو اس میں ڈالا، پیسے پھینکے اور غائب۔ بھاجی کا بازار تو ایک سوشل کلب ہے۔ نازلی کی ماں بھاجی خریدنے گئی ہیں۔ ایک گھنٹے سے پہلے نہیں لوٹ سکتیں پھر بھی ان کے آنے کی راہ نازلی اور شریف کی نگاہ میں چپی ہے۔ وہ بائیں طرف سے ٹریفک لین کے موڑ سے گھوم کر آئیں گی تو صاف نظر آ جائیں گی۔

نازلی کے ابا اس وقت مولوی خیر الدین کے ہاں حقہ پینے گئے ہیں پھر وہاں سے یوپی ریستوران کے کباب کارنر میں بیٹھ کر دونوں دوست کچھ چکھیں گے۔ ان دنوں کو یاد کریں گے جب عورتیں پردہ کرتی تھیں لڑکے بزرگوں کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے تھے اور گڑ روپے کا پانچ سیر ملتا تھا۔ ابا جی کے آنے کی راہ بھی طے شدہ ہے۔ وہ بائیں طرف سے تغلق روڈ سے آئیں گے۔ اس وقت دائیں بائیں اور سامنے تینوں طرف سے نازلی کا گھران دو جاہت کے مارے کی نظروں کے سامنے ہے کوئی خطرہ نہیں۔ آسیہ بالکونی میں بیٹھی کشیدہ کاری میں بظاہر مصروف ہے مگر اس کی نگاہیں ہر لحظہ آگے پیچھے، دائیں بائیں سامنے پھرکی کی طرح گھومتی ہیں۔ آسیہ گیارہ برس کی ہے مگر کبھی وہ بھی تو پندرہ برس کی ہوگی، کبھی اس کا بھی تو وقت آئے گا۔ پھر سات برس کی فوزیہ اس کے لیے پہرہ دیا کرے گی۔

نازلی نے کسی قدر مایوسی کے عالم میں کہا "اس طرح یونہی ہم کب تک ملتے رہیں گے؟"

شریف بولا "کہو تو تمہارے گھر پیغام بھجوا دوں؟"

"کہو گے کیا؟ بلکہ کہلواؤ گے کیا؟"

یہ کہا جائے گا کہ لڑکا فلم انسٹی ٹیوٹ میں ڈائرکشن کورس کر رہا ہے۔ ڈپلوما لیتے ہی ڈائرکٹر بن جائے گا۔"

"ابا جی تو فلم کا نام سنتے ہی کانوں پہ ہاتھ رکھ لیں گے۔"

"ہاں مگر فلم تو وہ دیکھتے بھی ہیں وہ اور مولوی خیر الدین اور یوپی ریستوران کے مالک معراج میاں اکٹھے چھپ کر پکچر دیکھنے جاتے ہیں۔ تم نے مجھے خود بتایا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" نازلی بولی: "مگر ابھی تو تم کچھ کماتے دھماتے نہیں ہو وہ کیسے مانیں گے؟"

"اسی لیے تو کہتا ہوں۔ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ ایک سال اور رک جاؤ۔ ایک سال بعد ڈائرکشن کورس کرتے ہی پچیس ہزار کا ڈائرکٹر ہو جاؤں گا۔"

"سچ؟" نازلی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، جیسے وہ بڑے بڑے پوسٹروں پہ ہدایت کار محمد شریف، کا نام دیکھ رہی ہو۔

یکایک آسیہ نے سامنے کی بالکونی سے اٹھ کر ایک سرخ رومال زور سے ہلایا۔ نازلی چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "میں جاتی ہوں۔ ابا جی آ رہے ہیں۔"

آسیہ نے دور سے ابا جی کو دیکھ لیا تھا۔ لال رومال ابا جی کی آمد پہ کھلتا تھا، نیلا رومال امی کی آمد پہ۔ نازلی نے چوکڑی بھری اور مغربی گیٹ سے نکل کر پارک کے پچھواڑے کی سڑک سے ہوتی ہوئی، اپنے گھر کی طرف بھاگی بھاگی چلی گئی۔ جلدی میں شریف اتنا بھی نہ پوچھ سکا کہ دوبارہ ملنا کب ہوگا۔ خیر، بعد میں کوئی ترکیب نکالی جائے گی — ابھی وہ یہ سوچ کر نیم کے پیڑ کے نیچے، بچھے ہوئے بنچ سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا زرد رو نوجوان بھاگتا، لڑکھڑاتا پارک میں داخل ہوا اور دوڑتے دوڑتے شریف سے چند قدموں کے فاصلے پر اچانک تیورا کر گر پڑا۔ اس کا سر رائل پام کے تھلے سے زور سے ٹکرا گیا تھا۔

کچھ دیر تو شریف بھونچکا کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اور جھک کر اس نے اس نوجوان کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔ رخسار زرد اور ہونٹ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نیلے ہو رہے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرتے ہوئے شریف نے غور سے بے ہوش نوجوان کے سر کا معائنہ کیا۔ بلاشبہ سر زور سے پتھر کے گملے سے ٹکرایا تھا، سر سے خون نہیں بہہ رہا تھا اور بظاہر سر پر چوٹ کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔ پھر بھی ظاہر تھا کہ یہ نوجوان سر کی اندرونی چوٹ سے ہی بے ہوش ہوا تھا۔

شریف نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پارک میں اتفاق سے اس وقت کوئی دوسرا نہ تھا۔ پارک کے پچھواڑے دائیں بائیں راستہ چل رہا تھا۔ سامنے کی سڑک پر چار راستے پھوٹتے ہیں۔ ایک راستہ باندرہ اسٹیشن کو جاتا ہے، دوسرا کارٹر روڈ کی طرف، تیسرا باندرہ مسجد کی جانب، چوتھا لنکنگ روڈ۔ اور ہاں ایک پانچواں راستہ بھی ہے! گھوڑبندر کو جانے والا راستہ۔ اٹومیٹک روشنیوں کے انتظام کے علاوہ یہاں دو سنتری ہر وقت چوکس کھڑے رہتے ہیں۔

شریف نے ایک سنتری کے پاس جاکر کہا "ایک آدمی پارک میں بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" سنتری نے اسے جواب دیا۔ "شام کا وقت ہے ٹریفک کا عالم دیکھتے ہو۔ اس وقت ڈیوٹی چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

"تو میں کیا کروں؟" شریف نے بے بسی کے عالم میں سنتری سے مشورہ طلب کیا۔

سنتری کو شریف کے چہرے پر عجیب معصومیت اور ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ نرمی سے بولا "اسے ٹیکسی میں بٹھا کر ہسپتال لے جاؤ۔"

شریف نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پانی کا نل کہیں نہیں تھا، ورنہ پانی لیکر دو چار چھپکے بے ہوش نوجوان کے چہرے پر مار کر اسے ہوش میں لانیکی ترکیب کرتا۔

سامنے داؤد بھائی فرنیچر والے کی دکان کے برابر میں فاروق میاں پھل والے کی دکان تھی۔ فاروق اور شریف کسی زمانے میں اکٹھے ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ پھر شریف چلا گیا اور فاروق نے یہ پھلوں کی دکان کھولی۔ اب فاروق کم سے

www.angoothachaap.blogspot.com

کم پندرہ سو مہینہ اس دکان سے کما لیتا ہے۔ شریف فاروق کی دکان سے سنترے اور موسمبی کا تازہ جوس ایک گلاس میں بھر کر لے گیا اور واپس واسوانی پارک میں چلا گیا۔

بے ہوش نوجوان کے جسم میں تھوڑی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ شریف اسے گھسیٹ کر نیم کی چھاؤں میں لے آیا۔ اس نے نوجوان کے سر کو اپنی گود میں لے کر اس کے ہونٹوں کے اندر پھلوں کا رس ٹپکانا شروع کیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے نوجوان کے سر کو سہلانا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے نوجوان رس پیتا چلا گیا۔ پہلے مشکل سے پھر آسانی سے۔ آخر میں جب گلاس ختم ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عجیب گہری ڈوبی ہوئی وحشت ناک آنکھیں تھیں۔ سارے چہرے پر جیسے کھال منڈھی ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ کئی دن سے اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" شریف نے گہری ہمدردی سے پوچھا۔

"غول!" نوجوان نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ایں؟"

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"غاں۔"

شریف کو یقین آ گیا کہ پتھر کے گملے سے ٹکرا جانے سے چوٹ کہیں اندر لگی ہے۔ دماغ مختل ہو گیا ہے بے چارے کا۔

"کہاں جاؤ گے؟" شریف نے بڑی نرمی سے کہا۔

"قرنٹ!" اس نوجوان کے منہ سے نکلا۔

بے چارہ پاگل ہو گیا ہے شاید! "شریف نے سوچا۔ اگر اسے چند گھنٹے آرام اور دماغی سکون ملے گا تو عقل پلٹ آئے گی۔ ایسا ممکن تو ہے اس نے

www.ma-elibrary.blogspot.com

کئی کتابوں میں پڑھا ہے۔

یہ سوچ کر شریف نے ایک ٹیکسی لی اور نوجوان کو باندرہ سے اپنے کانونٹ ایوی نیو، سانتا کروز واقع گھر میں لے آیا۔ شریف اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا تھا اس کی ماں ایک کالج کی پرنسپل تھی اور شریف کی ہمدردیوں سے نالاں رہتی تھی اسے دیکھتے ہی بولی "اب کس کو لے آئے؟"

شریف ایک دم بھڑک کر بولا "اس کی حالت نہیں دیکھتی ہو۔ امی بے چارہ پتھر کے ایک گملے سے ٹکرا کر عقل و شعور کھو بیٹھا ہے۔ ذرا ایک پلنگ پر اس کے لیے بستر بچھا دو۔ چند گھنٹے سوئے گا تو یقیناً ہوش میں آ جائیگا۔"

ماں نے مکمل بے اعتنائی کے عالم میں کئی با خاموشی سے سر ہلایا مگر وہ اپنے بیٹے کے مزاج سے واقف تھی۔ اس نے ایک پلنگ پر بستر بچھا دیا۔ ملازم قاسم، امی اور شریف تینوں نے مل کر اسے بستر پر لٹا دیا۔ مگر بستر پر لیٹ کر بھی وہ نوجوان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر منہ ہی منہ میں بدبدا کر بولنے لگا:

"انگ ....۔ انگ ...۔ انگ ...۔"

"انگ کیا؟" شریف نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے پوچھا۔

"انگ ـــ انگ۔" اس نوجوان نے بڑی مشکل سے کہا۔

"انگارے؟" شریف نے پوچھا

شریف کی امی نے تیزابی لہجے میں کہا: "ہاں ہاں، اس کے ماتھے پر انگارے رکھو خود بخود ہوش میں آجائے گا۔"

"امی ـــ امی! کیوں مذاق کرتی ہو؟ انسانیت بھی کوئی چیز ہے؟ ہے کہ نہیں۔" شریف نے غصے میں کہا۔

"انگ ....۔" وہ نوجوان پھر بڑبڑایا۔

شریف بولا "اسے کچھ یاد آ رہا ہے۔ اس کا شعور واپس آ رہا ہے۔"

پھر اس نے نوجوان کی طرف جھک کر پوچھا:

"انگوچھا؟"

نوجوان نے انکار میں سر ہلایا۔

"انگرکھا؟"

نوجوان نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

"انگولا کے فرنٹ پر جانا چاہتا ہوگا شاید۔ اسے وہیں بھیج دو۔" شریف کی ماں نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ وہ اور کچھ بھی کہنے والی تھی مگر اپنے بیٹے کی شعلہ بار نگاہوں کو دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"انگور؟" یکایک شریف نے پوچھا۔

نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"انگور کھاؤ گے؟" شریف نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

نوجوان نے پھر "ہاں" میں سر ہلایا۔

شریف کی ماں نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ مگر شریف کسی کی سننے والا نہیں تھا اس نے فریج کھول کر انگور کے دو گچھے نکالے اور انہیں پلیٹ میں رکھ کر اس نوجوان کے منہ میں ایک ایک دانہ کر کے ڈالنے لگا۔

کوئی ایک کلو انگور کھا کر اس نوجوان نے لمبی سانس اور کروٹ بدل کر پلنگ پر سو گیا۔

دو گھنٹے کے بعد وہ نوجوان خود بخود اٹھا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا: "مجھے یہاں کون لایا؟"

شریف یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اس پاگل کی عقل لوٹ آئی ہے۔ شریف نے اس نوجوان کو اس کا پورا قصہ سنا دیا۔

نوجوان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہا "اس لیے ـ ابھی تک ـــ میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے گھر جانا چاہیئے۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"کلیان میں"۔

"بمبئی سے کلیان لوکل ٹرین جاتی ہے میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں"۔

"نہیں نہیں، میں خود چلا جاؤں گا"۔ وہ نوجوان پلنگ سے اٹھ کر بولا۔

پھر اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا "مگر میرا بٹوا کہاں ہے؟"

"تمہارا بٹوا؟" شریف نے پوچھا "کیا تمہاری جیب میں نہیں"؟

نوجوان نے اپنی پتلون کی دونوں جیبیں ٹٹولیں اور شبہ کی نگاہوں سے شریف کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہارے بٹوے میں کتنے روپے تھے؟" شریف نے رک کر پوچھا

"بیس روپے" نوجوان نے کسی قدر برہمی سے جواب دیا۔

شریف اس نوجوان کو کھار اسٹیشن تک چھوڑ آیا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ نوجوان کا مختل دماغ ٹھیک ہو گیا ہے اور اب وہ عام انسانوں کی طرح ٹھیک باتیں کر رہا ہے پھر بھی اس نے احتیاطاً حمید کو جیسی اس نوجوان نے اپنا نام بتایا تھا تفصیل سے ہدایتیں دیں۔ کھار سے بی بی سی آئی لوکل لے کر دادر جانا۔ دادر سے جی آئی پی لوکل پکڑ کر سیدھے کلیان چلے جانا۔ ایسی ٹرین پکڑنا جو سیدھی کلیان جاتی ہو۔ تھانے اسٹیشن پر بھی نہ رک جاتی ہو"۔

"مجھے سب معلوم ہے" اس نوجوان نے سر ہلا کر کہا "اب مجھے سب یاد آ رہا ہے"۔

وہ نوجوان شریف سے رخصت ہو کر دادر کی بجائے راستے ہی میں ماہم اتر گیا اور اسٹیشن سے باہر نکل کر مختلف بلڈنگوں اور چالوں سے ہوتا ہوا اپنی کھولی میں پہنچا، جہاں اس کی ماں بڑی پریشانی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی ماں غصے سے بولی "ارے حمید، تو اب تک کہاں تھا؟ دیکھ کتنی رات ہو گئی"۔

حمید بولا: "میں کیا کرتا ماں مجھے ایک آدمی نے پکڑ لیا۔ کسی طرح چھوڑتا

ہی نہیں تھا۔ کبھی جوس پلاتا، کبھی انگور کھلاتا۔ کبھی اپنے بستر پر سو جانے کے لیے کہتا۔ چلتے چلتے مجھے بیس روپے بھی دے گیا۔ عجیب پاگل سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اتنا کہہ کر حمید نے بیس روپے جیب سے نکال کر اپنی ماں کو دیے اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی کے اسٹیشن کے اس پار لکشمی جی کا ایک مندر ہے اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں، جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے۔ اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں لکشمی کا پل ہے۔

مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ ان کے پہننے والے بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ لوگ ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے اس پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا، گندا سرخ کنارہ، گہرا نیلا اور لال، وہ اکثر انہی رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے۔ دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذب نظر نہیں رہے۔ کسی زمانے میں ممکن ہے جب یہ نئی خریدی گئی ہوں، ان کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں، مگر اب نہیں ہیں دھوئے جانے سے ان کی آب وہوا مر گئی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انہیں سو بار دیکھئے یہ آپ کو کبھی دکھائی نہ دیں گی نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں ادھڑے ہوئے ٹانکے ہیں بدنما چکتے داغ جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔

میں ان ساڑھیوں کی زندگی کو جانتا ہوں کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں اس لئے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں! ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔

ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی ساڑھی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے آپ نہیں میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا اور اب اس دوسری ساڑھی کا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ جیون بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیون مل کے کپڑا کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اسے بہت جلد جانا پڑتا ہے اس لئے شانتا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا کے رکھتی ہے کیونکہ صبح اسے خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کے لئے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے اور اب وہ ساتھ میں اپنے چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے۔ اور دوپہر کے قریب واپس چال میں آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولھا اسی وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کے نو بجے۔ ان اوقات کے ادھر اور ادھر اسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ ایسے میں جب

کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں اس دن شانتا بائی میری نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی ہوئی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولھے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے شانتا بائی اس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور کی چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور اسے اکثر بھوک لگتی رہتی ہے۔ اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانی پڑتی ہے اسے اپنی ماں کا دودھ دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے پھر یہی خشک باجرے اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں۔ اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر دن بھر باجرا اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پئے گا، دو دن پئے گا تیسرے دن کی تاڑی کے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے۔ بھاجی کی ترکاری ہے۔ تیل اور نمک ہے بجلی اور پانی ہے شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے۔ جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ہے۔ جبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدری نکمی ساڑھی دیتے ہیں۔ ان کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کر جوڑ کے گانٹھ کے ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے اور بکھر جاتا ہے۔ پانچ روپے چار آنے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آجاتی ہے۔ نتاتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنے ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی اور وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے انہیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی جب اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی جہاں میلوں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے، ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیرو توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی جانے اب پیڑوں میں وہ مزاج ہی نہیں ہے وہ شیرینی اور گھلاوٹ نہیں ہے۔ وہ رنگ اور چمک دمک کہاں جاکے مر گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے نتاتا بائی بھی برتن مانجتے، بنتے کھانا پکاتے اپنی ساڑھی دھوتے، اسے پل کے جنگلے پر لاکر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹڑی پر بہتے جاتے ہیں اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے دیکھتے

ہیں اور لپس دوسرے لے گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیوتا بائی کی ساڑھی جو نتاتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے۔ گہرے بھورے رنگ کی ہے بظاہر اس کا رنگ نتاتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹ ہوتی تھی۔ لیکن اب وہاں پیوند ٹانکے لگ گئے ہیں اور اتنی دور سے معلوم بھی نہیں ہوتے ہاں آپ وہ بڑا سا پیوند ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت جگہ سے پھٹ گئی تھی لگایا گیا ہے یہ ٹکڑا جیوتا بائی کی اس سے پہلی ساڑھی کا ہے اور دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیوتا بائی بیوہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھلا دینے کی کوشش کیا کرتی ہے جیوتا بائی اپنے خاوند کے لئے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لئے نشے میں تھا کہ وہ اس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈو اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربے کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا بلکہ وہ تو اب دن رات کھانستا رہتا تھا

کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دفن ہو گئے تھے جیسے خیموں اور ٹینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے [illegible] پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے [illegible] اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا [illegible] گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا سنائی دیتی [illegible]

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

سے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ کے بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیسے ہوا اگر غصے میں آ کے ایک دن اس نے جیونا بائی کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے پر قربان نہیں کی جا سکتی اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی ڈھونڈو ایسا نہ تھا اسے اپنی بیکاری کا غم تھا۔ اپنی پچیس سال ملازمت سے برطرف ہونے کا رنج تھا اور سب سے بڑا رنج اسے اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی نہ دیا تھا۔ پچیس سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ باہر آ کے اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ان پچیس سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، اس کا سارا خون اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اسے بیکار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی، یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی، اگر اس کے پاس علاج کے لئے پیسے ہوتے وہ آنکھ تو گل گل کر سڑ سڑ کر خیراتی ہسپتال میں ڈاکٹروں اور کمپونڈروں اور نرسوں کی بے احتیاطیوں، گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی ہوئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا، ان دنوں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجھنے کا کام دلوا دیا تھا اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور شائستگی اور صفائی سے برتنوں کو دھو نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ

رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں تھوڑی طاقت کے لیے دوسرے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی، اور کام کرتی رہی کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔

لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی حقیقت اس میں تھی کہ وہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا ریشمی لباس پہنے بیٹھی ہے لیکن جیونا کو یقین نہ آیا اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہیں کرے گی اس کا اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ بیاہ اپنی کھولی میں کیا تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی یہ سب کچھ چھوڑ کے فارس روڈ کیوں جانے لگی اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا کیونکہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کیلئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کے چلی نہیں آئی تھی ہاں جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش جلانے کے لئے لے جانے لگے۔ اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری بھرکم عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اور اسے دیکھ کر جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اس کا سب کچھ مر گیا ہے مر گئی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اس کی بیٹی، اس کی عزت جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے ننگا، بھوکا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اسی ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاندان زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہو گئی۔ اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کے بیٹھ گئی ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ تھا جس میں کوئی ظالم جبر برپا تھا انسانی جسموں کو گنے کے رس نکالنے والی چرخی میں ٹھونسا جاتا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکا جاتا ہے۔ اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ نیا زرد ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنجو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں مجھے ۔۔۔ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ جیسوں مل اور ۔۔۔ مل سے مزدوروں کو بھی تنخواہ ملتی ہے اس لئے میں بھی انہی کے ساتھ ۔۔۔ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں کلرک ہوں میں فورٹ میں نوکر ہوں۔ میں دسویں پاس ہوں۔ میں ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں عرضی لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیراعظم کی تقریریں کر سمجھ بھی لیتا ہوں آج ان کی گاڑی تھوڑی دیر میں مہالکشمی کے پل پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں آ جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیراعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی کی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ ذہنی تو روز

کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے رات کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑ جاتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔ باقی پندرہ دن سود خوار پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھٹکتے گھسیٹ گھسیٹ کر کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں۔ مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔ گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں جب وہ مسکراتی تھی تو سینما کی تصویر کی طرح خوب صورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں، کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں وہ تو لپس کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سہتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں کبھی کبھی سوچتا ہوں، شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے، شاید اسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں اک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے مگر اب ان باتوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے اب تو آزادی آ گئی ہے اور ہمارے وزیراعظم نے یہ کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی کام کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں ساوتری کو اپنے وزیراعظم کی تقریر جو اخبار میں چھپی تھی سنائی تو وہ تو اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے غصے میں آ کر چولہے کے قریب پڑا ہوا ایک چمٹا میرے سر پر دے مارا زخم کا نشان جو آپ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں۔ مگر آپ انہیں دیکھ نہیں سکیں گے میں دیکھ سکتا ہوں اتنا میں سے ایک نشان تو اسی مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک کنجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے۔ اور جسے نہ پاکر میرا بچہ دن بھر روتا رہا، ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا۔ جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی، لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی کسی سے مجھے روپے ادھار نہ مل سکے تھے اور ساوتری جبل پور نہ جا سکی۔ ایک نشان اس تار کا تھا جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں ان چھوٹے چھوٹے گدلے گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی بھری پڑی ہے۔ روز روز دھونے پر بھی یہ داغ نہیں چھوٹتے اور شاید جب تک یہ زندگی رہے گی یہ داغ یوں ہی رہیں گے۔ ایک ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں لیکن بھورا رنگ ان میں جھلکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے۔ جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں۔ جیسے انہوں نے کبھی شبنم میں ہنستی ہوئی دھنک افق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے شاید ان کی جوانی ہے وہ جیون کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک تواتر، ایک تسلسل یکسانیت لئے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبو بھیئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہ ہو بڑی منحوس ہوتی ہے جادو ٹونے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بد روحوں کو بلا کے اپنے گھر میں لیتی ہے میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے اسی وجہ سے اسے بہت جلد روزگار مل گیا۔ کہتے ہیں جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا شوق تھا۔ اسے بیڑی کا تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا شوق تھا تو صرف اس بات کا اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے، مگر پھر اس نے سوچا ان ستر اسی روپوں میں کیا ہوگا، آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا، چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا اس لئے جھبو بھیا نے ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپے میں خرید لیا۔ اسی روپے اس نے نقد دیئے بیس روپے ادھار میں رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کر دیئے بعد میں جھبو بھیا کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دھیرج گاؤں کی اس کی برادری ہی کی تھی جھبو بڑا خوش تھا چلو یہیں بیٹھے بیٹھے کام ہو گیا۔ اپنی جات برادری کی، اپنے ضلع کی۔ اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چاؤ چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور زور سے دوہے گانے لگتے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو، دن میں کھولی میں لٹریا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور لٹریا۔ دونوں گاتے تھے ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا اس لئے انہوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا، میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ دیکھ کر خود بھی ہنک ہنک کر گانے لگے لٹریا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پئے نہ سگریٹ نہ تاڑی نہ شراب، لٹریا بیڑی سگریٹ تاڑی سبھی کچھ پی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی مگر جب سے وہ بدمعاش کے پلّے پڑی اسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی کئی بار تاڑی پی کر لٹریا نے جھبو پر حملہ کر دیا اور جھبو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلانے لگتا لٹریا کو مت مارو مادرچود لٹریا کو مت مارو۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کر کے جھبو غصے میں آ کے طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کے طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے۔ جیونا نے کہا۔ تمہیں پھر برہمنوں کو بلا کے پراشچت کرنا پڑے گا اور تمہارے پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبو نے طوطے کو بدرو میں غرق کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو اس شادی پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں وہ خود بھی لٹریا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا اور کئی بار بلا وجہ اسے پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر ہو کر اس کی نگرانی کرتا رہا مگر آہستہ آہستہ لٹریا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لٹریا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی، وہ تو ایک گھر چاہتی ہے

چاہے وہ چھوٹا سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے۔ جو اس کا اپنا ہو چاہے وہ جھبو جیسا ایسا ہر وقت شور مچانے والا، زبان دراز تیخی خوار ہی کیوں نہ ہو، وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں ہو اور اب لٹریا کے پاس گھر بھی تھا، اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لٹریا اپنے میاں مٹھو کا پنجرا چھیلا رہی تھی اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی اور جو خلا سے میں ہمکتا ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں لٹریا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی نیچے گئی اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کے اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور اپنی کھولی میں لے آئی پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے گنی کھاتے کے منیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر جھبو نے کسی اسے دو ہاتھ جڑ دیئے اس پر بہت واویلا مچا اور منیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کے جھبو کی خوب پٹائی کی اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا۔ ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہ تھی۔ لٹریا نے بہت بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اٹھا لی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی، جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے مگر اب وہ کسی مل میں کام نہیں کرتا، وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

سکتا رہتا ہے۔ بسیوں مل، جنوبل، لالڈمل، پوار مل، ڈھن راج مل، لیکن اسکے
لئے ہڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت
کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے اس نے پیلی ساڑی سب
چھوڑ دی ہے۔ ہاں اس کی ساڑھی ترمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ
سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لیلا کو اپنی
ساڑھی پر پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے اور اپنے میاں منگو
کرچوری کھلانا بند کرنا پڑے گی

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے۔
لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے اور اس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ
ساڑھی دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے کیونکہ یہ ساڑھے پانچ روپے
چار آنے کی ہے۔ اس کا کپڑا اس کی چمک دمک کہتے ہیں کہ یہ ان سے ذرا
مختلف ہے۔ آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہو گی مگر میں جانتا
ہوں کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بتا ہے اس کا کنارہ چمک
دار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپے ہے یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ
ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے ہیں
اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا
تھا اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے اس کا دل جوان ہے۔
اس کا جسم جوان ہے۔ اس کی امنگیں جوان ہیں۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی
کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے وہ پٹہ بڑا ڈھیلا ہے
اور گھومتے ہوئے بار بار چھٹپٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج
کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا کیونکہ کام چل رہا تھا۔ اور
دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا ہے۔ پٹے کو
تبدیل کرنے کے لئے روپیہ خرچ ہوتا ہے مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا

جا سکتا ہے اس کے لئے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے
ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا۔ تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو
نامنظور ہوئی کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا۔ اس لئے منجولا کو
کوئی ہرجانہ نہ ملا اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی جو اس کے
خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لئے خریدی تھی کیونکہ اس کے پاس
کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی
وہ اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد بھی وہ دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی
کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی اور جو ساڑھی تھی وہ یہی
گدلے سرخ رنگ کی تھی پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا کنارہ گہرا نیلا ہے
شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی اس کا
خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے
کی لاتی، اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق
اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے ایک سفید ساڑھی
پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ
ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس ساڑھی سے
جیسے اس کے مرحوم خاوند کی باہیں لپٹی ہیں جیسے اس کے بے تاب پیار کے
شفاف بوسے مرتسم ہیں۔ جیسے اس کے [illegible] بانے میں اس کے خاوند
کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز خوشبو [illegible] سیاہ بالوں والی چھاتی کا
سارا پیار روشن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑھی [illegible] ایک بڑی قبر ہے جس کی
ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم سے [illegible] لپیٹے رہنے پر مجبور ہے۔
منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اسکی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

پہننے والی مر چکی ہے پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود رہتی ہے ۔ روز کی طرح دھلی دھلائی ہوا میں جھول رہی ہے ۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر گھسنے آنگن میں رہا کرتی تھی ۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو ۔ وہ اب جیل میں ہے ۔ ہاں سیتو کی بیوی اور اس کا کوئی لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب نیچے پڑے رہتے ہیں ۔ سیتو سیتو کی بیوی ۔ ان کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں ۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لئے آنا کھانا کپڑا ابھی نہیں ملتا ہم لوگوں کو ملتا ہے اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں ۔ وہیں پکاتے جھتنا ۔ زمین پر پڑے سو رہتے ہیں ۔ یہیں پر بڑھیا مائی ماری گئی تھی ، وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں پلو کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے ۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کی ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی ۔ نہیں وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی چل پھر بھی نہ سکتی تھی ۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے ، یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے ۔ اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے یعنی اپنی زندگی کے لئے دو وقت کا روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے ۔ اس لئے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دیدی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور زور سے نعرے لگاتا تھا ۔ پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیدیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی ۔ ہم لوگوں نے ترانے دروازے بند کر لئے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا اور پھر جیسے بند گھروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے ادھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو ۔

تھوڑی دیر کے بعد سناٹا ہو گیا ، اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کے دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری

چال کے قریب بڑھیا پڑی تھی ۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے ۔ جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے ۔ اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے ۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہئے تھا ۔ مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے ۔ مُردوں کی عزت و احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے یہ ساڑھی چھلنی چلانے کے لئے نہیں ہے ۔ تن ڈھکنے کے لئے ہے ۔ وہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے ۔ کیونکہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری امنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔ نہیں گولی نہیں چلی ، کوئی جلوس نہیں گیا ۔ بھنگی کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے ۔

لو باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی ۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری ۔ میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی ۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لئے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے ۔ اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے ۔ جو مہالکشمی پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں ۔ یہ چھ ساڑھیاں جو بہت معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں ، ایسی معمولی عورتیں جن سے ہمارے ملک کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں ۔ جہاں ایک کونے میں چیز لٹکا سکتے ہیں ۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے ۔ اوپر طاقچے میں شیشہ ہے ۔ کنگھی ہے سیندور کی ڈبیا ہے ۔ کھاٹ پر ننھا سو رہا ہے ۔ انگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں ۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں ۔ جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں ۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں ہمارے چھوٹے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں ۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

نشان ہیں وزیراعظم صاحب! یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں یہ کوئی بڑا ملک بڑا عہدہ اور بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یا ایسی کسی چیز کی طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں دیکھئے، شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔ جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لئے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بے کار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطی ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمتی ہے۔ یہ بڑھی مہنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کے پھالے میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے اور گندم کے سٹے سے خوشے بن کر لہرانے لگے۔

لیکن وزیراعظم صاحب کی موٹر نہیں رکی، وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکتے اور تقریر کرنے کے لئے چوپاٹی پر چلے گئے، اس لئے اب میں آپ سے کہتا ہوں۔ اگر آپ کی گاڑی ادھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ اور پھر آپ ان رنگ دار ریشمی ساڑھیوں کو بھی دیکھئے۔ جنہیں دھوبیوں نے اسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہ پانے والے رہتے ہیں، آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔

دیکھئے میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف؟

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

پپیا

نواب بڑا مرتبی اور نرم نما سا لونڈا تھا۔ زرینہ کو اس لئے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر، رو دھو کر صبر کر لیتا تھا، دوسرے نوکروں کی طرح بوریا بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اور وہ بہت دبلا تھا اور بہت کھاتا تھا اور سمجھ میں نہ آتا جو کچھ وہ کھاتا تھا وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی دیوار یا کسی دروازے سے لگ کر نیم دراز حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسیٹ رہے ہیں، سر بائیں طرف لٹکا ہوا ہے تو کولہا دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ ماتھے پر ہے تو دوسرے ... سے بیٹھے کبھی رہتے ہیں نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرنے کا شوق تھا۔ انھیں کی طرح وہ فقرے چبا کے چپٹا کر کے بار بار کھینچ کھینچ کے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا اس لئے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور نخروں کے باوجود قابل برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا حالانکہ اسے صرف اوپر کے کام کے لئے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا اس لئے اگر نواب کھانا نہ پکائے تو کون پکائے اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب، یہاں کسی کو فرصت

ہی میسر تھی۔

نواب کو جب تین دن اور کچن میں بینگن بگھارنا پڑے اور مس کی چٹنی میں گرکٹھ سے مسالے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اس کی ساری تتلاہٹ اور نسائیت ختم ہو گئی، مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا

"بڑا صاحب ہم سے نہیں ہوتا۔ ہم کو ایک دن کی چھٹی دو۔ ہم آپ کے لئے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔"

"کوئی باورچی ہے تمہاری نظر میں؟" زرینہ نے اس کی جھنجلاہٹ پر مسکرا کر پوچھا۔

کچن سے باہر آ کر نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اس کے مزاج کی نسائیت پھر ابھرنے لگی اس پر اسے گھر کی مالکن کی مسکراہٹ جو ملی اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اوپر اچکایا اور دوسرا نیچے کیا بایاں کولہا اندر کی طرف جھکایا، دایاں کولہا ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ ادا سے ملتے ہوئے بولے اب لائیں گے، کہیں نہ کہیں سے آپ کے لئے باورچی۔"

نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کا مسئلہ ایک پراسرار ریاکار کی طرح بار... سے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہو گیا۔ جی چاہا سالے کو دوں دو چار جھانپڑ اور اس کی ساری اتراہٹ نکال دوں مگر ضرورت باورچی کی تھی۔ اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت کسے تھی تو زرینہ کو اس لئے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینی پڑی۔

ایک روز ... کے بعد اتوار تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیزار بیٹھا ہوا گلابی صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی بوسے ہوئے دبا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنا سر ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ جب تک دباؤ نہیں کچھ نکلتا نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کی پٹی تھامے گردن ایک طرف لٹکائے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

"میں - میں ..... وہ جس پڑے ..... ہم باورچی لے آئے ہے۔"

"کیا ہوا ہے" میں نے ڈپٹ کر پوچھا

نواب صاحب ہو کر ذرا سنبھلتے ہوئے اپنے دونوں بازو دروازے کی پٹی سے اتار کر اپنی کمر پر رکھ لیے۔ پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کسی اور کو راستہ دے کر بولے "اندر چلے آؤ۔"

کالا دبلا پتلا کرنجی آنکھوں والا آدمی اندر آیا، عمر کوئی پچیس برس کی ہوگی، چھوٹے چھوٹے کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں تنگ ماتھا، بال اٹھے ہوئے گال اندر دھنسے ہوئے۔ دانتوں کی ریخوں میں پان کا بھورا میل نمایاں شیو کے باوجود ٹھوڑی پر کہیں کہیں بال رہ گئے تھے۔ عجیب کراہت سی محسوس ہوئی۔

"تم باورچی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"اوم پرکاش"

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر نواب سے کہا "اسے بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ۔ وہ دیکھ لیں اور پسند ہو تو رکھ لیں۔"

دوپہر کے کھانے میں شاہجہانی زردہ اور شملہ مرچ میں بھرا ہوا قیمہ تھا۔ اور دم کئے ہوئے آلو تھے، مٹر پلاؤ اور رائتہ اور دو طرح کا میٹھا شاہی ٹکڑے اور دودھی حلوہ۔ ہر چیز عمدہ اور نفیس تھی صحیح ذائقے۔ دل میں نے خوش ہو کر کہا "اوم پرکاش کھانا تم ٹھیک پکا لیتے ہو۔"

"اوم پرکاش!" زرینہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولی "مگر اس کا نام تو اشتیاق ہے؟"

میں نے باورچی کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں دونوں ہاتھ اپنی ناف

پر رکھے کھڑا تھا اور مجھے دیکھنے کی بجائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بے؟ تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟" میں نے باورچی سے پوچھا۔

"وہ جی، صاحب آپ کے کمرے میں آیا اور آپ کو دیکھا تو اب سمجھا کہ شاید آپ ہندو ہیں تو میں نے آپ کو اپنا نام اوم پرکاش بتایا، پھر میں بیگم صاحب کے کمرے میں گیا تو مجھ کو ایسا لگا جیسے وہ مسلمان ہیں تو میں نے ان کو اپنا نام اشتیاق بتا دیا۔"

"مگر ہے دقت، تم ایک کمرے میں اوم پرکاش اور دوسرے میں اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو؟"

"دلی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب ایک گھر میں اوم پرکاش تو دوسرے گھر میں اشتیاق بتانا پڑتا ہے .... پیٹ روٹی مانگتا ہے صاحب!" اس نے نہایت شکایت کے لہجے میں کہا۔ اور اس کے لہجے سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے شکایت اس امر کی نہیں ہے کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا بلکہ اس بات کی ہے کہ پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے۔

گرمیوں کے دن تھے دوپہر میں جب حبس بڑھنے لگا، تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کے لئے باتھ روم میں جا گھسا ٹونٹی گھما کر معلوم کیا کہ شاور خراب ہو چکا ہے خراب کو، دراصل تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے تلووں میں تیل چپڑ رہا ہے۔ اشتیاق جب گھبرا آیا، میں نے اس سے کہا "چوک میں جا کر نلکی والے کو بلاؤ۔ شاور خراب ہے۔"

"میں ٹھیک کیے دیتا ہوں" اشتیاق بولا۔

"تم؟"

"وہ مرغا بنکر ہے جی ... جی میں پلمبر کا کام بھی جانتا ہوں۔"

پانچ منٹ میں اس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

شام کو بجلی کا پیڈسٹل پنکھا جو صحن میں چلتا تھا خراب ہو گیا۔ زرینہ نے نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی دوپہر کی نیند سے فارغ نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اشتیاق کو بلایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ چوک میں پنکھے والے کے پاس چلا جائے اور اپنے سامنے پنکھا درست کرا کے لائے۔ بہت گرمی ہے آج تو رات بھر صحن میں پنکھا چلے گا۔ اشتیاق نے گھبرا کے تس سے پنکھے کا معائنہ کیا معائنہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں بازو اپنی ناف پر رکھ لیے۔ بولا۔ حضور میں یہ پنکھا ٹھیک کر سکتا ہوں۔

"کیا تم پنکھے کا کام بھی جانتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا

سر جھکا کر بولا "جی بجلی کا کام بھی جانتا ہوں، پنکھا ٹھیک کر لیتا ہوں۔ ابھی کر کے دکھاتا ہوں۔"

ڈیڑھ گھنٹے میں پیڈسٹل فین فر فر چلنے لگا۔ میں نے اشتیاق کو نئی نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ مسکرایا۔ آخر میں سر کو کچھ سمٹ کر جھک کر کچن میں چلا گیا۔

رات کے کھانے میں زمردی چکن تھا۔ چکن کا ذوق تو اندر ہی اندر ملتی ہے۔ بریانی، پلاؤ، قورمہ اور چکن چاٹ نظر آتی ہے۔ چکن چاٹ کھا لو تو اندر لذیذوں کا خزانہ ملتا ہے۔ اور بادام اور کشمش کے ساتھ عجیب بھول بھلیاں قسم کی ڈش تھا۔ میٹھا سخت اور مزے دار میں نے ایک روپیہ انعام دیا تو جھک کر سات بار کورنش بجا لائے بولے آپ نے انعام دیا ہے یہ بندے پر اکرام!"

"ارے، میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں سر جھکا کر بولے۔ میں شاعر بھی ہوں میرا تخلص تنہائی ہے۔"

میری طبیعت شاعروں سے بہت الجھتی ہے سنا ہے ہر وقت پان کھاتے رہتے ہیں۔ اور شعر لکھتے رہتے ہیں پہلے جی چاہا آج ہی جواب دے دوں۔ پھر اگلے بیس روز میں معلوم ہوا کہ حضرت بیس بائیس دوسرے پیشے بھی جانتے ہیں کرسیاں بُن لیتے ہیں۔ موڑھے ٹھیک کر لیتے ہیں۔ مٹی کا ٹوٹا پھوٹا سامان بھی

ٹھیک کر لیتے ہیں۔ کیونکہ بڑھئی کا کام بھی سیکھا ہے سینما کے گیٹ کیپر بھی رہ چکے ہیں گھڑیاں بنتی ہیں۔ پنواڑی کے ہاں کام کیا ہے۔ ٹھیلا کھینچا ہے۔ کھلونوں کی فیکٹری میں کام کیا ہے حجام رہ چکے ہیں سلائی سے لے کر دھلائی تک کے سب مراحل پہ پینٹر کی حیثیت سے پرکھ چکے ہیں۔ بٹ کے ڈرامے میں مسخرے بھی کے ساز دیں۔ گن جیلتے بھی ہیں اور چاٹ بنانا بھی جانتے ہیں اور سب سے بڑی یہ بات کہ انتہائی کم خوراک ہیں زرینہ کو ان کی عادت بہت بھائی ہے کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی ہے اس لئے اس نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا سکہ سارے گھر میں جم گیا اس طرح جناب بیاگ سے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی کاہل اور ناکارہ ہوتا گیا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق کبھی کبھی کچھ چاہتا ہے عمر میں نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ سال چھوٹا ہوگا مگر تھوڑے ہی عرصے میں نواب اشتیاق سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ مالک ہو اور اشتیاق اس کا غلام ہو۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ سب کچھ جذبۂ احسان مندی میں ہو رہا ہے بعد میں خیال آیا کہ ممکن ہے اشتیاق نواب پر عاشق ہو گیا ہو حالانکہ نواب پر عاشق ہونا بڑے دل گردے کی بات ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ عاشق کی آنکھوں کی بینائی بہت کمزور ہو جس سماعت تقریباً نہ ہو۔ اور کوئی لطیف جذبہ دل میں نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا خیال بھی صحیح نہ تھا اشتیاق نہ نواب کو اپنا محسن سمجھتا تھا اور نہ اس پر فریفتہ تھا بس اسے دوسروں کو کھلانے کا مرض تھا۔ اور دوسروں کو کھلا پلا کر دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتا تھا۔ چونکہ وہ خود کم کھاتا تھا اس لئے وہ اپنے حصے کی خوراک بھی نواب کو منتقل کرتا جا رہا ہے بعد اس کے لئے سالن کا بہترین حصہ مخصوص کر دیتا۔ پہلے اسے کھلاتا اور پھر خود کھاتا ہوا، وہ نواب نے کام میں دلچسپی لینا بالکل ختم کر دی گھر بیٹھی بلی کی طرح ایک کھٹیا پہ پڑا رہتا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق اس کی خدمت

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

ہماری بُر صاحب چڑھا کر بیان کرنے میں بڑا مزا آتا اور اسے گھٹیا پر مستقل آرام کرنے کا مشورہ دیتا اس کے لئے بازار سے دوا لاتا اور چپل سگریٹ اور بیڑی کے پیسے بھی خود دیتا، کبھی کبھی ایک آدھ بش شرٹ اور پاجامہ پتلون بھی سلا دیتا۔ ہوتے ہوتے اشتیاق کی تنخواہ کا بیشتر حصہ نواب پر خرچ ہونے لگا۔ اور نواب اپنی تنخواہ کی کل رقم بچا کر اپنی ماں کو علی گڑھ بھیجنے لگا۔

زرینہ نے کئی بار اشتیاق کو سمجھایا اسے اپنی تنخواہ جمع کرنے کے فائدے گنوائے مگر اشتیاق پر اس کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا مسکرا کر بولا: "بیگم صاحبہ بچہ ہے، کھاتا ہے تو کیا کرتا ہے۔"

"اے تم اپنے لئے بھی کچھ کر رکھو کم بخت" زرینہ چڑ کر اس سے کہتی "دوسرے دن کے لئے کیوں مرتا ہے۔"

"میرا آگے پیچھے کون ہے بیگم صاحب؟" اشتیاق گردن جھکا کر جواب دیتا۔ "بھائی نہیں، بہن نہیں، ماں نہیں، باپ نہیں سب ہجرت کے فسادوں میں مارے گئے۔ میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

کچھ دنوں بعد نواب کی ماں کا خط علی گڑھ سے آیا اس نے نواب کے لئے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی، دو ماہ بعد شادی تھی ماں اسے بلا رہی تھی غفور سائیکل والا جس کے ہاں دہلی آنے سے پہلے نواب کام کرتا تھا وہ اب پھر اسے کام دینے پر تیار تھا اس لئے نواب واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ اب تو تقریباً مفت کی کھاتا تھا ورنہ سارا کام اشتیاق نے سنبھال لیا تھا زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لئے کسی کو نہ رکھے گی اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے نوکر کی ضرورت نہیں تھی۔

زرینہ بولی: "نواب کی شادی ہو رہی ہے اب تو بھی شادی کر لے، اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی، مجھے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔"

شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا اس کی بھنویں تن گئیں تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈولنے لگیں، اور اس کے چھوٹے سے ہونٹ پھڑکنے لگے، مگر وہ کچھ نہ بولا سر جھکا کر کھانے کے کمرے سے باہر نکل گیا اس کے جانے کے بعد نواب کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی کھانے کی میز کے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا ارے صاحب یہ کیا شادی کرے گا اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا

"معلوم نہیں بیگم صاحب! یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔"

چند منٹ بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کر صحن میں ہاتھ دھونے کے لئے آئے تو دیکھا اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا ڈھیر اپنے سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے سے لگاتار جھپک رہی تھیں، مجھے اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز بعد نواب نے علی گڑھ جانے کا پروگرام بنایا۔ اس کے جانے پر اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑک رہے تھے مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا، اس نے نواب کے لئے سفری ناشتہ تیار کر لیا، حالانکہ صرف ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا مگر قیمے کے پراٹھے اور سرخ مرچوں کا اچار اور آلو کا بھرتا اور بیسنی روٹی اور مکھن کی ایک ٹکیا وہ نواب کی بھوک سے واقف تھا خود اپنے خرچ سے اس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا اس لئے ہم شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود نواب کے لئے آٹو رکشا لے آیا اس کا سامان آٹو پر رکھا اور اسے پرانی دلی کے اسٹیشن پر گاڑی میں سوار کرا کے واپس آیا۔

دو دن تک اس طرح مضطرب اور بے چین پھرتا رہا۔ جیسے اس کا گھر لٹ گیا ہو اور وہ کسی اجاڑ ویرانے میں گھوم رہا ہو۔ کھانے کا معیار بھی

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

دم گر گیا تھا، تو روہ اس کے جذبے کی طرح تلخ تھا اور حلیہ اتنا پتلا جیسے کسی نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہو۔ چپاتیاں بے ڈول اور بے ڈھنگی اور ان پر جگہ جگہ مایوسی کی راکھ لگی ہوئی۔ دو دن تک تو ہم نے کسی نہ کسی طرح صبر کر کے کھانا زہر مار کیا اور یہ سوچ لیا کہ اگر معاملہ یوں ہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن بعد اشتیاق سنبھل گیا کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اٹھا لایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچے پر صرف کرنے لگا اور اپنی تنخواہ کا کافی حصہ بلی کے لئے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا اور یوں دیکھا جائے تو بلی کا بچہ نواب سے کچھ کم نہیں تھا اور اس کے عشوے اور نخرے بھی نواب سے کم نہ تھے اور وہ اتنا ہی اترایا تھا اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا اور دو ہی دن میں اشتیاق سنبھل گیا۔ اور کھانے کا اور پکانے کا معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصل حالت پر آ گیا اور ہم لوگوں نے چین کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو ناں نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا یا کسی فنی چیز کو چھوڑ دینے کی عادت نہ تھی اس قدر جس قدر احساس کہ مجھے یہ کام بھلا کر کے دکھا دینا چاہیئے اسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا اور ایک عجیب سی لگن تھی اس کے دل میں جو اسے ہر کام پورا کرنے کے لئے اکساتی رہتی تھی چاہے وہ اسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا اور چونکہ میں ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہوں، اس لئے زرینہ نے مجھے کئی بار ریڈیو ٹھیک کرنے کے لئے کہا مگر دفتر کی طویل جھک جھک کے بعد ذہن اور جسم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ریڈیو کھول لینے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں یہ کام آج اور کل پر ٹالتا رہا تھا۔

ایک دن میں دفتر سے جو آیا تو دیکھا ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں پرانا ریڈیو کھلا پڑا ہے اور اشتیاق گھبرائی ہوئی حالت میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور زرینہ قریب کھڑی ہوئی دو بکس ہو رہی ہے میں نے آنکھوں کے اشارے ہی اشارے میں پوچھا کہ کیا بات ہے؟ زرینہ بولی۔ اشتیاق نے کہا تھا۔ میں ریڈیو بھی ٹھیک کر لیتا ہوں اور چونکہ کئی دن سے فرصت نہیں مل رہی ہے اس لئے میں نے اشتیاق کو کام پر لگا دیا۔ دو ڈھائی گھنٹے سے یہ کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ تم نے بتایا تھا کہ معمولی سا نقص ہے۔"

میں معاملے کی نزاکت سمجھ گیا۔ اشتیاق اپنے چھوٹے سے ماتھے پر بال گرائے مجھ سے آنکھیں چرائے ریڈیو پر کام کر رہے تھے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو کھول تو لیا ہے مگر اب جوڑنا نہیں آتا چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا میں نے زرینہ کو باہر بھیج دیا اور خود اشتیاق کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہو گیا، مگر میں نے اشتیاق کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اسے یہ کام نہیں آتا، بلکہ میں نے اس طریقے سے ہر کام آگے بڑھایا جیسے ہر کام اشتیاق کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ گھنٹے بھر میں ریڈیو ٹھیک ہو گیا زرینہ بہت خوش ہوئی اس نے اشتیاق کو دو روپے انعام دیا مگر چند دن بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی، زرینہ نے کہیں اس سے پوچھا "کیا تم رس گلے بنا سکتے ہو؟"

"جی ہاں" اشتیاق فوراً بولے۔

"ایک دن بنا کے دکھاؤ؟"

"آج رات ہی کو بناؤں گا۔"

رات کے کھانے کے بعد دیر تک اشتیاق کچن میں کچھ کھٹر پٹر کرتا رہا۔ انگیٹھی سے دیر تک دھواں سلگتا رہا، منہ میں بیڑی جلتی رہی، ماتھے کے بال

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

الجھتے رہے اور کچن کی زرد روشنی دیر تک صحن میں اپنا سر ٹپکتی رہی۔ کوئی ایک بجے کے قریب کچن کی بتی بجھی اور اشتیاق نے دوسرے دن صبح ناشتے میں برف میں ٹھنڈے کیے ہوئے رس گلے تازے اور حلوہ اور گلاب کی خوشبو سے مہکتے ہوئے پیش کیے۔ "یہ رس گلے تم نے بنائے ہیں؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا

"جی" اسی خاکسار نے" اشتیاق دروازے سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں" زرینہ نے تعریف کرتے ہوئے کہا

"یہی تو ان کی خوبی ہے" میں نے کہا۔ "یہ سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں۔"

"جی نہیں" اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی "تو آج رات میرے سامنے رس گلے بناؤ۔ میں خود دیکھوں گی۔"

"جی بہت اچھا"

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں ایک فہرست پیش کی جو منظور کر دی گئی، دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار میں رہے۔ سرِ شام زرینہ نے ان کے تھیلے کی تلاشی لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے تو نہ لے آئے ہوں۔ رات کو کھانے کے بعد اشتیاق نے بڑے اہتمام سے رس گلے بنانے کا کاروبار کچن میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور ہر چند منٹ بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک تابے میں رس گلے سے کر آئے تھے۔ کھانڈ کے متلاطم شیرے میں ٹینس کی گولیوں سے بھی دو تہائی کم حجم کی سفید سفید گولیاں تیر رہی تھیں۔ زرینہ چیخی "ارے یہ رس گلے ہیں؟ ہماری گولی میٹھی کے برابر؟"

"ابھی چھوٹے ہیں۔ دیکھیے دیکھیے بیگم صاحبہ! اور یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں مگر رات بھر شیرے میں رہیں گے، صبح تک پھول کر اتنے بڑے رس گلا ہو جائیں گے" اشتیاق نے سمجھایا۔

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے مگر نیند کا غلبہ شدید تھا اس لیے ہم سو گئے۔ صبح جب ناشتے پر بڑے حجم کے بڑی گولائی کے سفید رس گلے پیش کیے گئے تو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کی ٹینس کی گولیوں کے برابر حجم والے رس گلے پھول کر اسی قدر بڑے ہو گئے تھے۔ شب رات بھر کون جاگے اور کون چوکیداری کرے؟ اشتیاق ضرور صبح صبح بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے اور رات کی گولیاں انھوں نے نالی میں بہا دی ہوں گی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دوسروں کو رس گلے کھلا سکتا ہے، جو اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے اس سے الجھنا بے کار ہے۔

جوں جوں بلی کا بچہ بڑا ہوتا گیا، اشتیاق کا خبط بھی دوراں بڑھتا گیا۔ چند ماہ میں ہمارے سامنے ایک خوب صورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی جس کے بال مخمل کی طرح ملائم تھے جو انسان کی ملیٹھی سرگرمیوں میں ہر خبر رکھتی تھی اور جب گردن نیوڑھا کے آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف دیکھتی تو وہ بے چارہ دل تھام کے رہ جاتا تھا۔ بلی بھی قیامت کی حرافہ، مولی کی گرتھلی سی، کبھی دھیرے دھیرے ٹھمک ٹھمک کر چلتی، کبھی ایک دم چنچل ہو کر چھلانگ لگاتی اور اشتیاق کے کندھے پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور پیار سے اس کی گردن چاٹنے لگتی۔ کبھی اون کا گولا بنی ہوتی یا گٹھی بیٹھ کر خوب دھوپ کا مزہ لیتی کبھی اس کی باہوں میں پوری طرح پھیل کر بیٹھ جاتی۔ عورت کی پوری بیر خوشی سے بیزاری میں کچھ تحریک تغافل، اور ایک مستی آمیز انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق ایک عجیب مسرت اور حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن رکھا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

تھا، مگر پیار کی اہمیت میں اسے صرف گلو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن میری غیر حاضری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم میں دستک دی۔ سردیوں کے دن آ چکے تھے۔ اس لئے زرینہ صبح ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گون میں ملبوس ایک سویٹر بن رہی تھی۔ "کون ہے" زرینہ نے پوچھا

"میں ہوں اشتیاق"

"اندر آ جاؤ" زرینہ بولی

کاغذ پنسل لئے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے جھجکتے سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا "دیکھئے"

"زرینہ بولی کیا کل کا حساب ہے ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ دیکھئے تو" اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہے تھے

"آخر ہے کیا؟"

"ایک غزل کے تین شعر ہوئے ہیں"

زرینہ چند لمحوں کے لئے بھونچکی رہ گئی، پھر اس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی اور مسکرا کر بولی "تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو" زرینہ نے فقرہ مکمل کیا۔

"جی جی بالکل کہہ سکتا ہوں، آپ لکھئے میں بولتا ہوں" "کہیئے" زرینہ نے زچ ہو کر کہا۔

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور ایک عجیب محویت کے عالم میں بولا۔

"تنہائی میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے مجھ سے جو ہو سو ہو۔"

"مگر اس کی بحر کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"بحر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا "بہرحال غزل تو غزل ہے"

"مگر اس کا وزن" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب آپ لکھئے تو" اشتیاق نے کامل دلجمعی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی، "بولو آگے چلئے" اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے

"تیری جدائی میں ہو گئے ہم مست قلندر جو ہو سو ہو
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو"

زرینہ نے پوچھا "کہتا ہے تنہائی، مگر تنہائی تو مونث ہے"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو،

"اجی بیگم صاحب! یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں"

اور یہ مست قلندر کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ اور پنسل بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیئے گرج کر بولی "اشتیاق اگر آج کے بعد تم نے مجھے اپنا کوئی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی" اشتیاق کھسیا کر سر کھجاتے تھے بے حد محجوب اور شرمندہ سے دکھائی دے رہے تھے، زرینہ کو اس پر ترس آ گیا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

زم لہجے میں مسکرا کر کہنے لگی، میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔"

"فوراً سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"لائف اینڈ لنگ" اشتیاق انگریزی میں بولے

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کیا کرتے تھے۔ یا آج کے ان مزدوروں کی جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم مصدر کی محتاج نہیں مگر اپنا مفہوم ادا کرتے ہیں اس کی انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا "تم اتنے سارے دھندے جانتے ہو، اگر تم کوئی ایک دھندا پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک چھوٹے سے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "سال چھ ماہ ایک دھندا کیا پھر دوسرے میں چلا گیا، اسی طرح زندگی کے پینتیس چھتیس برس گزار دیئے ہیں باقی بھی گزر جائے گی۔"

"تم کسی ایک دھندے میں جی کیوں نہیں لگاتے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں لگتا۔" اشتیاق سر جھکا کر کسی اقبالی مجرم کی طرح شرمندہ ہو کر بولا۔

"میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

"میاؤں" دروازے پر گلو تشریف لائیں اور وہ منہ اٹھا کے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی اشتیاق نے اسے گود میں اٹھا لیا

اور اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"گلو بھوکی ہے اسے دودھ دے آؤں۔"

"جاؤ۔"

اشتیاق پر کبھی کبھی نیم غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے ہیں۔ جبکہ وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ڈوبا الجھن میں خاموش بیٹھا رہتا تھا نہ جانے کیا سوچتا ہے خود ہی مسکراتا ہے خود ہی گھورتا ہے خود ہی ہنستا ہے کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے کیا گزرتی ہے اس پر وہ کون سا کرب ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے کون جانے کچھ بتاتا تو ہے نہیں کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے قیاس غالب ہے جب دل کی گھٹن اور سینے کا سونا پن حد سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو کوئی نشہ ضرور کرتا ہے کیونکہ مہینے میں ایک یا دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا، سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں چارپائی پر پڑا رہتا ہے اس کا سینہ دھونکتا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آ جاتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ دن نہ بدلا ہے نہ تاریخ بدلی ہے نہ اس نے کوئی نشہ کیا ہے۔ ورنہ ہم بھی اس لئے چپ رہتے ہیں، یہ کام بہت اچھا کرتا ہے ماہر ہی نہیں آرٹسٹ بھی ہے۔ اچھے کام کا اور فن کاروں کے دماغ کی ایک چول ڈھیلی ہوتی ہی ہے یہ سب جانتے ہیں۔

اس لئے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے اس سے کہ حیدرآبادی بینگن بنائے اور وہ سے ہوئے، کچھ عجیب سی ڈش جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس میں بینگن کے کالے کالے ٹکڑے مرے ہوئے چوہوں کی طرح تیر رہے تھے۔

"یہ حیدرآبادی بینگن ہیں؟" زرینہ چیخ کر پوچھتی ہے

"جی نہیں یہ جاپانی ٹاؤن ہے۔" اشتیاق کہتا ہے۔ "بالکل نئی ڈش ہے"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کھائے دیکھئے مجھے چکھئے بالکل نیا مزا ہے۔

"اٹھا کے لے جا! ابھی ابھی یہاں سے ورنہ سر پر دے ماروں گا" میں گرج کر بولتا ہوں، کیونکہ مجھے تو وہ ڈش دیکھ کر ہی متلی ہونے لگی تھی۔

اس وقت تو اشتیاق ڈش اٹھا کے لے گیا مگر بعد میں اس نے زرینہ سے کہا "صاحب بھی کیسی ناانصافی کرتے ہیں چکھے بغیر ہی پاس کر دیتے ہیں کھانے کو"

اشتیاق موتی تلیہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر مخصوص مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے موتی تلیہ پکانے کی فرمائش کی گئی جب دسترخوان بچھا تو منجملہ دوسری کی چیزوں کے ایک نہایت بدبودار اور سڑی ہوئی ڈش سامنے آئی۔

"یہ موتی تلیہ ہے" زرینہ نے حیرت سے پوچھا

"جی نہیں" اشتیاق فوراً بولے، "یہ پیسٹ ہے"

"پیسٹ کیا؟ تمہیں موتی تلیہ تیار کرنے کو کہا تھا۔ کہا تھا کہ نہیں" زرینہ خفا ہو کے بولی۔

"جی موتی تلیہ بگڑ گیا اس لئے میں نئی ڈش تیار کر دی ہے" اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا تو اسے فوراً نیا نام دے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں۔ اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کسی اعلیٰ خاندان کا لڑکا خود بخود بگڑ جاتے اور اس کے بگاڑنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔

اب کیا کہیں چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا مگر مہمان موجود تھے، اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے اس لئے خاموش رہ جانا پڑا

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم مہمانوں کو لیکر میٹنی شو دیکھنے چلے گئے اور

چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں میٹنی شو دیکھ کر جب ہم شام واپس ہوئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ "آگ آگ میرا گھر بچاؤ۔" لینڈلارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا

"اشتیاق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا

"کیا معلوم" لینڈلارڈ اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولا، "ایک گھنٹے سے چیخ رہا ہوں، اور وہ دروازہ ہی نہیں کھولتا، اور اندر کچن میں شاید دم گھٹ کر بے ہوش پڑا ہے"

میں اور زرینہ دونوں نے چلا کر دروازہ اشتیاق سے کھلوایا۔ اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر چلائے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے دونوں پتیلیوں کے سالن جل چکے تھے مگر خدا جانے ان میں اس نے کون سا مسالا ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک ان کی پتیلیوں سے اٹھ رہے تھے۔ "آگ آگ" لینڈلارڈ غصے سے چیخ رہا تھا۔

"کدھر ہے آگ؟" اشتیاق حیرت سے پوچھنے لگا۔

زرینہ بولی "یہ بے چارے ایک گھنٹے سے چیخ رہے ہیں، دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں، فائر بریگیڈ تک آگیا اور کچن کا دروازہ بند کئے غافل بیٹھے ہو۔"

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر تھوڑے نادم ہو کر سر کھجانے لگے۔ ایک انگلی اپنی ٹھوڑی پر رکھ کر بولے۔ "بحث چل رہی تھی"

"کیسی بحث؟" زرینہ کا پارہ چڑھنے لگا، "تم یہاں اکیلے بیٹھے ہو"

"گورنٹ کا مقدمہ تھا"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

"کیسا مقدمہ؟"

آبائی مکان کا مقدمہ تھا میرے اور چچا زاد بھائی لطیف کے درمیان وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی کے درمیان بحث ہو رہی تھی"

"کون ہے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی؟" زرینہ کا غصے سے پارہ چڑھنے لگا

"میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں، خود ہی کورٹ ہوں، خود ہی مدعی، خود مدعا علیہ، خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا" اشتیاق نے بتایا۔

"مگر کہاں بحث چل رہی تھی؟" زرینہ نے دانت پیس کر کہا

"یہاں" اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر کہا۔ اور سر جھکا لیا

زرینہ کا دل اشتیاق سے ہٹنے لگا، میرا بھی۔ عمدہ باورچی ہونے کے باوجود اس کی خامیاں اب جان لیوا ثابت ہونے لگیں۔ ادھر اشتیاق سے زیادہ اس کی بلی گلشن نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں درحقیقت اشتیاق کی وجہ سے اس سے بے اعتنائی تو برتتا تھا کیوں کہ اشتیاق نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ اسکے سوا کوئی دوسرا اس کو توجہ دے۔ مگر غالباً گلشن کو یہ بات پسند نہ تھی وہ مجھے بھی اپنے مداحوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مصر تھی، دو ایک بار وہ کمرے میں اخلاقاً ہوئی آ بیٹھی مگر میں نے کوشش کر کے بھگا دیا پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں درحقیقت سوئی نہ تھی سونے کا بہانہ کر رہی تھی وقت بھی بلی گلشن نے وہ چنا تھا جو میرے دفتر سے آنے کا تھا، مقصد یہ تھا کہ ہم تمہارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے اور تم اسے برداشت کر گئے تو دوسری بار تمہارے سینے پر چڑھ کے سوئیں گے یعنی جس قدر میں بے اعتنائی دکھا رہا تھا اسی قدر وہ مجھے اپنے قریب لانے پر مصر تھیں اس وقت میں نے جوں ہی بستر پر سوتے ہوئے دیکھا تو غصے میں آکر انھیں دم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا بے حد خفا ہو کر غرائیں اور جھلا کر کمرے سے باہر چلی گئیں مگر اس کا بدلہ گلشن

نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں کمبل کی دھجیاں روئی کے دونوں تکیے ادھیڑے پڑے ہیں اور گلشن انہیں نیچے مار مار کر نوچ رہی ہے اور کمبل ہواؤں میں اڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا، جھپٹا مارنے کے لئے آگے بڑھا تو گلشن چھلانگ لگا کر دوسرے دروازے سے باہر اور بلی چلانے لگی "میاؤں، میاؤں" مگر آج میں نے قسم کھائی تھی آج میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر لیا، اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم سے کچن سے صحن سے باتھ روم تک گلشن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اسے پکڑ لیا دونوں ہاتھوں سے دبا کر اسے گھر سے باہر لے چلا، اشتیاق سہما ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ مگر وہ میرا غصہ دیکھ کر منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا صرف اسکے ہونٹوں کے کونے پھڑک رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آکر میں ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اس سڑک پر لمبی کھڈے اور گڑھے تھے اور اس پر ان گنت وزنی ٹرک گھوں گھوں کرتے ہوئے گزرتے تھے، میں نے ایک ٹرک قریب آتے ہوئے دیکھ کر یکایک گلشن کو زور سے جھلایا اور نشانہ باندھ کر گزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا اشتیاق کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

ٹرک سڑک سے گزر گیا چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن ٹرک پر پس کر بھی لیٹی ہے پھر یکایک وہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور بجلی کی سرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئیں دو ایک بار اس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا مگر ادھر ہمارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالف سمت دوڑتی ہوئی چلی گئی، اور پھر ہمارے گھر کبھی نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا۔ مگر گلشن کہیں نظر نہ آئی چوتھے دن اس نے سامان باندھ لیا۔ اور بولا صاحب میرا حساب کر دیجئے۔ میں

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟" زرینہ نے پوچھا

اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں چرا کے زرینہ سے کہا، "بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بلی کے ساتھ سلوک کیا وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ جو تمہاری بلی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانا کون دے گا؟" میں نے غصے سے بلند آواز میں کہا۔

زرینہ معاملہ سلجھانے کے خیال سے بولی، "ارے ایک بلی کی وجہ سے تم نگاق نوکری چھوڑتا ہے۔ میں تجھے ایسی سو بلیاں لا دوں گی۔"

"نہیں وہ تو میری گلشن تھی،" اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے سی جیسے وہ ابھی رو دے گا

"ارے گلشن تھی، کہ زلفن کہ کریمن، تیرا نام جا بے رکھ لینا" میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "سیکڑوں بلیاں گھومتی ہیں اس علاقے میں۔"

اشتیاق نے پھر نظریں چرا کر مجھ سے رخ موڑ کر زرینہ کی طرف ہو کر بولا "مجھے صاحب سے بڑا ڈر لگتا ہے اب تو"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا

"جب صاحب نے گلشن کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔"

"اپنے باپ کی طرح؟ کیا بکتے ہو؟" زرینہ غصے سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحے توقف کیا پھر ٹھہرے لہجے میں کہنے لگا "اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشے کی حالت میں مجھے کمرے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی۔ میں یقیناً مر جاتا مگر سڑک پر جہاں میں گرا اس پر ایک بڑا سا گڑھا تھا اور میں اس گڑھے سے باہر نہ نکل سکا، اور رات کا وقت تھا وہ ایک ٹرک میرے پر سے گزر گئے۔ پھر

شاید میں بے ہوش ہو گیا اور ماں دو تین بار کر چیخنے لگی کہ ایک میرے باپ کو ہوش آ گیا اور وہ بھاگ کر بھاگا آیا اور سڑک کے گڑھے سے اٹھا کے اپنے سینے سے لگا کے گھر لے گیا اور وہ میرا منہ چومتا تھا اور زور زور سے روتا تھا اور کبھی میری ماں اس سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی، اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر چھاتی سے لگا لیتا تھا مگر میں اس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب اس نے مجھے غصے میں اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا بالکل ویسا ہی چہرہ تھا اس وقت صاحب کا اس لئے میرا حساب کر دو میں یہاں نہیں رہوں گا۔" اشتیاق میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگا جیسے گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اس کا حساب کر دیا

تین سال بعد جب ہمارا تبادلہ بمبئی میں ہو گیا، تو وہیں بمبئی میں ملا ہمیں ایک گھر کی تلاش تھی اور اشتیاق ایک ہاؤس ایجنٹ تھا اور اس کا نام اب لالو کرمانی تھا اور وہ سندھی تھا اور سندھی کی زبان بڑے فراٹے سے بولتا تھا وہ کچھ قد کا ہو گیا تھا اور رنگ کا بھی کچھ کھل گیا تھا اور پہلی نظر میں کسی طرح بھی کانگریسی نیتا معلوم ہوتا تھا

"یہ کیا ڈھنگ ہیں تمہارے میاں!" زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے پوچھا۔

"ادھر ہے! بلڈنگ کا سارا دھندا سندھی لوگ کے پاس ہے اس لئے ہم بھی سندھی بن گیا، بیگم صاحب کیا کریں پیٹ روٹی مانگتا ہے۔"

"کوئی بلی وِلی پال رکھی ہے ادھر بھی؟" میں نے اس سے پوچھا

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا، "صاحب ادھر بمبئی میں چلنا پھرنا بھی مشکل ہے ایک ایرانی ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانے میں رکھنے کی اجازت دے دی ہے رات کو اس کی دکان کے سامنے پڑا رہتا ہوں، صبح گیارہ بجے تک اس کی دکان

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

میں سو سے بناتا ہوں۔ پھر رام داس مائی جانی کے دفتر میں جاتا ہوں۔"

"یہ مائی جانی کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا

"اصل میں ہاؤس ایجنٹ تو وہی ہے، میں اس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں"

"تم کو کیا ملتا ہے؟"

"کمیشن ملتا ہے۔"

"کتنا؟"

"مائی جانی کو ٹوئنٹی نائن پرسنٹ ملتا ہے پہلے اسسٹنٹ کو نائن پرسنٹ ملتا ہے۔" اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے۔ "ہم کو ون پرسنٹ۔"

"ون پرسنٹ؟" زرینہ نے پوچھا۔ "ون پرسنٹ آف واٹ؟"

"ون پرسنٹ" زرینہ نے پوچھا "ون پرسنٹ آف واٹ۔"

اشتیاق بولے۔ "ون پرسنٹ آف دی نائن پرسنٹ آف دی ٹوئنٹی نائن پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ۔"

زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی، اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے آخر جب زرینہ نے کسی طرح اپنی ہنسی پر قابو پایا تو بولے "آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔"

"کیسا ہے وہ فلیٹ؟"

اشتیاق انگلی پر گن کر گنواتے ہوئے بولے "ون بیڈ روم، ون باتھ روم، ون بیڈ روم، مور ون کچن، ون ہال اینڈ سیپریٹس۔"

"یہ اینڈ سیپریٹس کیا بلا ہے؟" زرینہ نے پوچھا

"بس اینڈ سیپریٹس!" اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو، ایم اے کرنے کے بعد آپ معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں۔ "آپ! اینڈ سیپریٹس۔ بیگم صاحب" اشتیاق نے پھر سمجھایا۔

زرینہ نے یکایک سمجھ کر کہا۔ "اچھا! تمہارا مطلب ہے آل سیپریٹس یعنی ہر کمرہ دوسرے سے الگ الگ ہے۔"

"بس اینڈ سیپریٹس" اشتیاق کے چہرے پر احساس برتری کی ایسی جھلک آ گئی گویا کہہ رہا ہو "اف! کتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی۔"

زرینہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا، "اور کیا کچھ کام کرتے ہو جی؟"

"جی ہاں ایک ٹوتھ پیسٹ تیار کیا ہے میری ٹوتھ پیسٹ۔"

"یہ میری کون ہے؟" زرینہ نے چونک کر کہا۔

شرما کر بولے "چھوکری ہے۔"

"تمہاری منگیتر؟"

"جی نہیں!" سر ہلا کر بولے "ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے، اس کی چھوکری ہے۔ کوکن کے گاؤں میں یہ بڈھی اپنی چھوکری کی شادی بناتا ہے۔"

"تمہارے سنگ؟" زرینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں، کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ، ولفرڈ اس کا نام ہے وہ بھی ادھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے، مگر بڈھی بہت غریب ہے، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے اس لئے ہم نے میری ٹوتھ پیسٹ نکالا ہے اور اس کو شام کے ٹائم بیچتا ہے اور اس کا پیسہ اس کرسچین بڈھی کو دیتا ہے۔"

"الو کا جنم کیوں اشتیاق؟" روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلک پڑی تھی۔

"الو کا جنم اس لئے صاحب" اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا "کہ اشتیاق کوئی فلم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے۔ ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے اور الو بھی رات کو جاگتا ہے۔ اس لئے بات بگڑے ذرا ذرا سوچیے کیا گہری حقیقت بیان کیا ہوں۔"

"ارے الو کے پٹھے" زرینہ نے دوپٹا منہ سے نکال کر یکایک چیخ کر

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

کہا "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چپل اتار کر اتنے ماروں گی .... اتنے ماروں گی کہ ..." زرینہ چپل اتارنے لگی اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خوب چمک گیا۔ پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھا پھر اس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو ڈھرے پر لگا کر اسے شاہی ٹکڑے بیچنے کی ترغیب دی۔ "بہت سستے میں بن جائے گا سیٹھ تمہارے اور ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا بے کار میں پھینکتا ہے ہم اس کو کام میں لائے گا خالی شکر کا خرچ ہے اور تھوڑی سی بالائی" اشتیاق نے اسے کہا "اور تمہارے پاس تین ریفریجریٹر ہے ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑا رکھے گا" گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا اسرو کرے گا۔

ایرانی مان گیا کیونکہ خرچا بہت کم تھا اس مٹھائی کا پہلے دن اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دو آنے فی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا ایسی عمدہ ڈش جس سے پیٹ بھی بھرے اور مٹھائی کی مٹھائی بھی معلوم ہو ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کا ہے کو کھائی تھی اب تو یہ حالت ہو گئی کہ اشتیاق کو دن میں دو بار شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بکری بڑھتی دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچن کا ہیڈ کک مقرر کر دیا کچن میں کام کرنے والے نوکر اشتیاق کو استاد جی کہہ کر پکارتے تھے اور ہوٹل کا مالک

میں نے دہرا کر پوچھا: "ناٹ الیون ون پرسنٹ آف دی نالو پرسنٹ آف دی ٹونٹی نالو پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ؟"

[illegible] اشتیاق نے سر ہلا دیا۔

"تو اس نظم کے گانے کون لکھے گا۔ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔"

"جی" اشتیاق نے اپنے ہاتھ کا ناخن دوسرے سے کریدتے ہوئے بولے "شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس نظم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا، ایک مکھڑا لکھا ہے؟"

"کیا ہو؟"

نگاہیں نیچی کئے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چور نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، "صاحب بات یہ ہے کہ غزل سے بیگم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے ہم نے غزل چھوڑ دیا مگر فلمی گیت ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا وزن بہت چھوٹا ہوتا ہے کیا مطلب کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور بیچ بیچ میں میوزک ہوتا ہے اس لئے ہم نے فلمی گیت شروع کیا ہے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے والا؟"

"تو سنادو؟" میں نے بے چین ہو کر کہا۔

اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔

"او صنم! او صنم"

میں نے لیا۔

الو کا تخم

"تیرے لئے"

زرینہ کی بری حالت تھی منہ میں دوپٹا ٹھونستے ہوئے اس کا چہرہ لال ہوتا جا رہا تھا بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی، اور اس سے پوچھا: "مگر

"ستا کر اپنی چھوکری کی شادی تمہارے سوا کہیں اور کر سکے؟" زرینہ نے بے حد تلخ ہو کر پوچھا۔

یکایک اشتیاق سٹپٹا گیا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں

اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے اور گال اور بھی اندر دھنستے گئے اور اس کا چہرہ ایک ایسی کالی کھوپڑی کی طرح نظر آنے لگا جس پر صرف کھال ہی کھال منڈھی ہو، اسے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا وہ اس وقت زرینہ سے نظریں چرا کر یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے چاروں طرف سے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

دیواریں اس پر گری جا رہی ہوں اور اس سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ میں نے جلدی سے بات کا رخ پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا: "جسم و تماشا ہی جاری ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہوں۔" اشتیاق نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"ہیرو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق اپنا نام لے کر بولے۔" ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس پکچر میں۔

"اور ولن کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

- اور شاید دلیپ کمار سمجھا جائے۔" اشتیاق سوچ سوچ کر بولے۔ "ولن کا رول بہت مشکل ہے۔"

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لئے اپنے منہ میں دوپٹا ٹھونس دیا۔ "اور ہیروئن؟" میں نے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔" اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے۔ "باہر دیکھ رہا ہوں۔"

"فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔ پھر اس کا انگریزی فقرہ اشتیاق کرنا ہی ٹکڑے کی مناسبت سے میرے دل کا ٹکڑا کہتا تھا۔

اگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور روح پر بیا دلتے ہوئے دیکھی ہے تو وہ یہی دن تھے۔ اس کے گلے بھرنے لگے اور کالے رخساروں پر صحت کا اور داپن جھلکنے لگا اور وہ کشتیاں اس کی تیلیوں کی جو اس کی آنکھوں میں ہر وقت بے چین اور مضطرب ہو کر تیرتی رہتی تھیں۔ اب بمبئی کے ساحل پر لنگر ڈالتی معلوم ہوتی تھیں جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا۔ اس سے قریب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ یہ چوک کے نکڑ پر سامنے ٹیکسیوں کا اڈا تھا اور قریب

ہی ایک نئی مارکیٹ کھل گئی تھی اس لئے صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں کے نوکر چاکر اور

کالجوں کے ٹیڈی بوائز اور کام کی تلاش میں گھومنے والے بیکار اور آوارہ گرد لونڈے جو کالج کی لڑکیوں سے زیادہ ٹیڈی معلوم ہوتے تھے۔ ان سب کا جمگھٹا اس ہوٹل میں اندر اور باہر رہتا تھا اور اس ہوٹل میں اشتیاق بہت پاپولر ہو گئے تھے۔ آتے جاتے میں اسے دیکھتا تھا۔ سہ پہر تک وہ اپنے ملگجے کپڑوں میں کچن کے اندر کبھی کچن کے باہر بڑی مستعدی سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہا کر دھو کر گیروے رنگ کا بنگالی کرتا اور اس کے نیچے کھلے پائنچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر ایرانی ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوتا۔ اس وقت اسے کام کی تلاش میں آئے ہوئے ادھر ادھر کے بہت سے لونڈے گھیر لیتے تھے۔ وہ ادھر ادھر کے بنگلوں اور فلیٹوں میں ان لڑکوں کو نوکر کرا دیتا کیونکہ ہاؤس ایجنٹ کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے آس پاس کی بلڈنگوں میں اس کی خاص جان پہچان ہو گئی تھی جن لونڈوں کو وہ نوکری کو نہ دلوا سکتا انہیں دوسرے دن آنے مشورہ دے کر چلتا کرتا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے لانڈری کے مالک سے باتیں کرتا جو اس کا ہم وطن تھا یعنی مراد آباد کا رہنے والا تھا جس کے لئے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی قسم کا ایسا صابن بنانا چاہتا ہے جس میں خرچا بہت کم ہو اور کپڑے بھی بہت عمدہ دھل جائیں مگر اشتیاق ابھی ابھی اپنی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

لانڈری سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہاؤس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا یا نئے گاہکوں کو لے کر مکان دکھانے کے لئے چلا جاتا۔ رات کو نو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا اور پھر ایک کپ چائے پی کر اور پھر بڑی سنجیدگی کر اور پان کھا کر وہ منٹو باورچی کے جھونپڑے میں جا کر سو رہتا کیونکہ اب وہ

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

بڑا آدمی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو باورچی کا جھونپڑا بارہویں نمبر ایک سڑک کے پیچھے ایک چھوٹے سے خالی پلاٹ پر تھا۔ اور اس کی بیوی بچہ ہونے کے باوجود اپنے میکے بیڑھی گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی ہوئی تھی اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے۔ سنتو نے اشتیاق سے کہا تھا۔

شاہی ٹکڑوں کی روز افزوں بکری دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے اس لئے مجھے دو ماہ بعد بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی غبن کیا ہے؟"

"نہیں آج تک ایک پیسے کا غبن نہیں کیا۔" ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

"پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا تھا؟"

"نہیں! کام اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا۔"

"پھر؟"

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا اور پھر جلدی سے بند کر لیا، پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا: "اس کا بھیجا پھر گیا ہے ہم اس کو ستر روپیہ پگار دیتا تھا وہ پگار بھی اس نے خرچ کر دیا۔

اوپر سے پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔"

"پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس؟" میں نے حیرت سے کہا: "اشتیاق تو اتنا [illegible] وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔"

"ہم جانتا ہے [illegible] لئے تو ہم بولتا ہے" ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہوکے بولا "وہ خود پاسو تو کیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اس کو منع نہیں کرتا تھا مگر وہ خود نہیں پیتا تھا ادھر ادھر کے بے کار اور لفنگے لونڈے لوگ جو ادھر ادھر آ جاتا ہوگی بلڈنگوں میں نوکری تلاش کرنے کے لئے آتا ہے وہ ان کو بھوکے

پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا صاحب جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا میرے حساب میں لکھو اب پانسو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا اس کو کس کے حساب میں لکھتے تا۔ اس لئے ہم نے اس کو نکال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" ایرانی کے آگے پیسے گنتے ہوئے رکھتے ہوئے کہا: "ایک ڈبیا کیونڈر کی دو۔"

"عجیب مغز پھر گیا ہے اس کا۔" ایرانی نے میرے پیسے گنتے ہوئے کہا "دو پیسہ کم ہے۔"

"ساری۔" کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سے دو پیسے اور دیئے اور کیونڈر کی ڈبیا لے کر اس سے پوچھا: "تو آج کل اشتیاق کہاں ہے؟"

"جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟" میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا: "تم نے اس بیچارے کو جیل بھجوا دیا؟"

"ہم نے کہاں بھجوایا ہے؟ صاحب وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے شراب کی اسمگلنگ [illegible] دھندے میں۔"

"اچھا [illegible] دھندا نہیں کرتا صاحب: مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھولی میں یہ دھندا کرتا تھا اور ادھر ادھر کی بلڈنگوں میں رات کو بوتلیں پہنچاتا تھا" ایرانی بولا: "پھر ایک رات پولیس نے اس کے جھونپڑے پر چھاپہ مارا۔ چھ بوتل پکڑا گیا تو اشتیاق بولا کہ سنتو بے گناہ ہے میں نے چھ بوتل شراب ادھر لا کے رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔"

"اس نے ایسا کیوں بولا؟"

"وہ بولا۔ ہمارا کیا ہے ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کی سزا جیل میں کاٹ لے گا مگر جب سنتو کی گھر والی اپنے بچے کو لے کر اس کے جھونپڑے میں آئے گی تو خالی جھونپڑا دیکھ کر رو دے گی۔"

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا: "بھیجا پھر گیا ہے اس کا۔"

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

زرینہ کو خیال آیا کہ جیل سے رہا ہوتے ہی اشتیاق ہمارے گھر آئے گا لیکن جب تین ماہ سے اوپر کئی دن گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو اسے کچھ مایوسی سی ہوئی مایوسی مجھے بھی ہوئی پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق ہمارے گھر نہیں آئے گا تو ممکن ہے ادھر ادھر ایرانی ہوٹل کے باہر ضرور دکھائی دے گا پر ادھر بھی نہیں نفتو باورچی سے پوچھا معلوم ہوا کہ اس کے ہاں بھی نہیں آیا پھر ہم دونوں نے سوچا ممکن ہے اشتیاق ہمارے شرم کے یہ علاقہ چھوڑ گیا ہو۔ یا بمبئی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب دو ڈھائی ماہ اور گزر گئے تو اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز ہم نے یکایک اسے ایک دعوت میں دیکھا، مسٹر زور آور خان کے ہاں ہماری دعوت تھی جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی سمجھ گئے کہ یہ کس کا اسٹائل ہے لقمہ چکھتے ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر ہم دونوں چپ رہے۔ کھانے کے بعد جب دعوت کی تعریفیں ہونے لگیں تو کچن سے خراماں خراماں اشتیاق برآمد ہوئے کالی پتلون کے اوپر لال بش شرٹ اور اس کے اوپر بھورے رنگ کا ایک میلا ایپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش بجا لاتے ہوئے، شاعرانہ انداز میں داد وصول کرنے لگے۔

نہ میں نے نہ زرینہ نے اس وقت انہیں پہچاننا مناسب سمجھا اشتیاق نے بھی اس وقت ہمارا رویہ سمجھ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔

بعد میں نصرت نے زرینہ کو الگ لے جا کے بتایا: "بہت اچھا کک مل گیا ہے مجھے اشتیاق احمد خان نام ہے اس کا اپنی طرف کا ہے تامل تیلگو پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے حالانکہ بچپن ہی سے ادھر رہا ہے، پھر کھانا غضب کا پکاتا ہے کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے جب سے یہ آیا ہے، میرے کچن کا خرچ

ڈھائی سو روپے کم ہو گیا ہے پورے ڈھائی سو روپے بچتی ہوں۔ میں اس کو صرف ستر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دوں تو سستا رہے گا۔"

زرینہ انجان بن کر بولی: "آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔"

"ارے شریف ایسا شریف!" نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں "میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے اور میرے سب سے چھوٹے بچے منو کو تو دل و جان سے چاہتا ہے کوئی سگی ماں کیا خدمت کرے گی جیسی وہ منو کی کرتا ہے ابھی چار دن کی بات ہے منو موٹر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا لا دوں گی، میں ٹال رہی تھی کیونکہ گھر میں درجنوں موٹریں پہلے سے پڑے پڑے پرانے ہو چکے ہیں۔ ذرا تو کیا ہوا۔" نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے بولی: "یہ موا اشتیاق دس روپے موٹر منو کے لئے لے آیا۔ تو میں نے غصے سے جھلا کر کہا میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی۔ تو موا بولا نہ دیجئے گا بیگم صاحب میں تو اپنے پیسوں کی موٹر لایا ہوں، منو کے لئے۔ اس پر وہ غصے سے گرج کر بولے تم کو کس نے کہا تھا منو کے لئے موٹر لانے کو۔ تو اشتیاق پہلے تو ان کی گرج سن کر سہم گیا پھر دھیرے سے سر اٹھا کر بولا، صاحب میں منو کا کہنا نہیں ٹال سکتا، جو کہیں گے میں ضرور سے کر آؤں گا اس نے ایسے مضبوط لہجے میں ان صاحب کو کہا کہ ان کا سارا غصہ اتر گیا مسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے میں بھی کیا بولتی بہن؟" چپ ہو کر سروتے سے سپاری کاٹنے لگی۔

زرینہ تو مونچھوں سے مسکرا مسکرا کر نصرت کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو جانتی ہے نہ اگلے ایک سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی جتایا کہ وہ ہم لوگوں کو پہلے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا بے چارہ جہاں لگا ہے لگا رہے اس کی خامیاں بتانے سے کیا فائدہ؟ اور نصرت صاحب کے ہاں رہ کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا بال ماتھے پر نہیں لٹکتے رہتے ذہنی طور پر بہت کم غائب رہتا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خان صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا حالانکہ ان کی دیکھ بھال کے لئے دو آیائیں الگ سے مقرر تھیں، مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اتنے گھر کے کسی ملازم سے نہ تھے میں نے اور زرینہ نے سکھ کا سانس لیا۔ "چلو اشتیاق نارمل تو ہوا"

ایک رات زور کی گھنٹی بجی کوئی تین بجے کا وقت تھا میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا، باہر سردار زورآور خان کا ڈرائیور حامد خان تھا۔

"حضور جلدی چلئے، بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے"

"کیا بات حامد؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے"

"ارے" میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں صاحب، اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے۔ اور خان صاحب لندن میں ہیں، گھر پر بیگم صاحبہ کے دو بھائی ہیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر مقصود کو ٹیلیفون کیا تھا بیگم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پولیس کیس ہے میں نہیں آ سکتا اور اشتیاق مر رہا ہے"

زرینہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی لرزتے ہوئے لہجے میں بولی
"تم ... جائیے جلدی جائیے۔ بے چاری ... سخت پریشان ہو گی"

خان صاحب کے ڈرائنگ روم میں عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور ان کے بھائی بہن اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے گم سم کھڑے تھے "کیا مر گیا؟"
میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"نہیں ابھی تو زندہ ہے" ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی

میں نے چادر ہٹا کر نبض دیکھی سینے کے زیر و بم میں خرخرے کی گھرگھراہٹ تھی اور نبض ٹوٹ رہی تھی نصرت ایک بھوری شال اوڑھے دنیا و فیہا سے بے خبر جیسی بیٹھی، آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

www.angoothachaap.blogspot.com

"کب اس نے زہر کھایا؟" میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کچھ نہیں بولی جیسے اس نے میرا سوال سنا ہی نہ ہو۔ نصرت کا چھوٹا بھائی بولا: "کوئی دو بجے کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز کی آہستہ آہستہ سے مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا جب جاگا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے وہ باورچی خانے سے رینگتا رینگتا میرے کمرے میں پہنچا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا: "مجھے بچا لیجئے میں نے زہر کھا لیا ہے"

"میں نے پوچھا "کون سا زہر؟"

"بولا "ٹک ٹو"

"ٹک ٹو کیا؟"

"ٹک ٹو ٹیک ٹو" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور آواز میں لکنت تھی وہ کیا کہنا چاہتی تھی ٹیک ٹو ٹی لیکن اس کے منہ سے صرف نکلا تھا صرف ٹک ٹو پھر وہ میری چارپائی سے لگ کر قے کرنے لگا میں نے مزید داستان سننا بے کار سمجھ کر ٹوکا، "اسے اٹھا کر نیچے گاڑی میں ڈالو، ہسپتال لے جائیں گے"

"مگر پولیس؟" نصرت کانپ کر بولی۔

"پولیس کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے" میں نے کہا۔ "نزدیک کا اسپتال کون سا ہے جانا دق"

"یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"کوئی چار میل"

"جلدی کرو"

جس وقت چار آدمیوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اتارا اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی سڑک کے کنارے روشنی کے قمقمے پانی میں بھیگے ہوئے یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر رو رہے ہوں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے چھوٹے چھوٹے دھبے نظر آتے تھے ورنہ جہاں نہیں کھا جاتا پھر تنگ و تاریک۔ گڈھوں کی ماری ہوئی ایک

www.ma-elibrary.blogspot.com

سڑک پر کاریں لڑکھڑا کر چلنے لگی جیسے ایک عورت اپنی عصمت لٹا کر رات کی اوٹ میں اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

ایمرجنسی وارڈ میں

اے خادم ٹھہرو!

اے خادم ٹھہرو!

زندگی! تم بھی توڑ کر۔

اشتیاق کا سر گیلوئے رنگ کے آئل کلاتھ کے گدوں پر ٹکا ہے اس کی آنکھیں کسی گہرے بھنور سے گڑھے میں جا گری ہیں اور ان پر یادوں کا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا چل رہا ہے

"پچھتر روپیہ ایڈوانس دو"

"یہ رسید لو!"

"وقفہ۔ مریض کو کمرہ نمبر میں لے جاؤ اوپر لفٹ سے میں ابھی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرتا ہوں"

باہر سے کوئی ٹرک گزرتا ہے گھوں گھوں اشتیاق کا سینہ ہوکتا ہے ہوں ہوں۔

آئل کلاتھ کا گدا بشمول اشتیاق بالوں میں لگی ہوئی ربڑ کی پہیوں کے ذریعے لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پر جا کر رک جاتی ہے لابی برآمدے سے گزرتا ہے کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں سات نمبر کا پردہ گرا دیا جاتا ہے ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں اور باہر بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

جیسے کوریڈور میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں اور ان کی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں کہیں کہیں مریض کوئی کراہتا ہے کوئی دیر دیر سے سسکتا ہے۔

"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"غبن کیا ہوگا" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے

"بہن نے ہوتے ہوئے گھر کا سارا خرچ اشتیاق کے سپرد کر رکھا تھا اور ہر وقت چار پانسو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے کل بہن نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا آج اس نے زہر کھا لیا میرا خیال ہے کہ"

"تمہارا خیال غلط ہے" نصرت کا دوسرا بھائی بولا "اشتیاق میں دس برائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے آج تک اس نے ایک دھیلے کی چوری نہیں کی۔ میرے خیال میں پچھلے ہفتے جو مراد آباد سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آبائی مکان والے مقدمے کا فیصلہ اس کے خلاف ہے معلوم ہوتا ہے اس کا غم اسے بہت ہوا ہے"

"جی نہیں" بڈھا حامد اپنی گھنی بھنوؤں پر ہاتھ پھیر کر بولا "اشتیاق کو روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں رہی یہ سب اس لونڈیا کا چکر ہے گلشن کا"

"گلشن!" میرے کان کھڑے ہوئے "گلشن کون ہے؟" میرے ذہن میں ایک بجلی کوندنے لگی۔

"ایک نئی آیا رکھی ہے صاحب نے بڑی بدصورت لونڈیا ہے مگر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کام کرتی ہے اس کا نام گلشن ہے اور صاحب ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔

"ارے" میں چونک گیا۔

"جی ہاں! اسی لونڈیا کے چکر میں زہر کھایا ہے"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو صاحب سے کہتے رہے کہ اس لڑکی کو نکال دو یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس وجہ سے اس کو نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے میں نے کہا بھلے مانس اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا، کام تو ٹھیک کرتی ہے مگر اشتیاق نہیں مانے برابر اس کی شکایت کرتے

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے: تو معلوم نہیں کب انہوں نے ہار مانی اور کب اشتیاق نے رویہ بدلا۔ یہ اس لڑکی پر مہربان ہونے لگے دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے، یہ اس کو کافی پلانے لگے۔ جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں پھر ایک دن گلشن کو یہ پتہ چلا کہ اس کو کافی ملتی ہے جبکہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے۔ تو ایک دم بدک گئی اور اس دن سے اس نے کافی پینے سے انکار کر دیا ایک دن اس نے اشتیاق کو بازار سے دیسی صابن لانے کو کہا تو اس کے لئے انگریزی صابن لے آئے، اس نے سو پیسے کا تیل منگایا، تو یہ گلزار ہیر آئل فیروزی اٹھا لائے گل گلشن کی ماں کا خط آیا جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی، دروازے پر کھڑے چوروں کی طرح سنتے رہتے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا اس نے گلشن کی شادی کی بات چیت مکمل کر لی ہے۔ لڑکا کسی سمنٹ فیکٹری میں ملازم ہے یہ خالی باورچی تھے، وہ انہیں منہ کیا لگاتی بس جب یہ سنا کچن ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بیکار ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ بولے کچھ نہیں: اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے: مگر اب جینا بے کار ہے: یہ آج دوپہر کی بات ہے رات کو انہوں نے زہر کھا لیا۔۔۔ حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا: مگر زہر کھانے سے پہلے اس کمبخت نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی؟

بالکل نہیں صاحب، حامد خفا ہو کر بولے: بالکل یک طرفہ عشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے۔ ان دس دنوں میں انہوں نے اس لڑکی سے نفرت بھی کی دوستی کی ابتدا بھی کی محبت بھی کی پھر آپ ہی آپ مر بھی گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا۔ لڑکی کو تو کچھ خبر نہیں ہے صاحب۔ وہ تو ایسی بدصورت ہے ایسی بھینگی کہ خیال ہی کرا سے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اس سے

عشق کر سکتا ہے۔

حامد چونکہ بڈھے تھے اور زندگی کے اس دور سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے داستان سناتے وقت ان کے لہجے کی شدید تلخی جس طرح ان کی مجبوری کی غمازی کر رہی تھی اس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کوٹھاری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے، اور مجھے دیکھ کر بولے: ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائین پر رکھ دیا ہے کھانے کو دوا دیدی ہے، انجکشن دے دیئے ہیں۔ کچھ لکھ دیئے ہیں:

شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے؟

ہوش میں تو ہے مگر ابھی بہت کمزور ہے ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہوگا: ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: صرف آپ اس سے چند منٹ کے لئے مل لیں۔ میں نے تھانے ٹیلیفون کر دیا ہے کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لئے آسکتا ہے کیوں کہ مریض کی حالت بہت نازک ہے:

اتنا کہہ کر ڈاکٹر کوٹھاری چلے گئے، تو نصرت کا چھوٹا بھائی برفروختہ ہو کے بولا: خان صاحب گھر پر نہیں ہیں، اور یہاں پولیس کے سامنے نہ جانے کس کس کے بیان ہوں گے۔ الو کے پٹھے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اگر مرنا ہی تھا تو سمندر میں ڈوب کے ہی مر جاتا کسی گاڑی کے نیچے آ کر مر جاتا، کہیں مر جاتا اس گھر سے دو سو گز پر ہی مرتا اور یوں ہم سب کو پریشان کر کے تو زہر نہ کھاتا:

بجا فرمایا آپ نے: میں نے کہا: مرنے والوں کو ہمیشہ اپنے بعد زندہ رہنے والوں کی سہولت کا خیال کر کے مرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں اگر آپ ایک رہنما سے خودکشی شائع کریں، تو بہتوں کا بھلا ہوگا: اتنا کہہ کر میں کمرہ نمبر سات میں داخل ہوا

www.angoothachaap.blogspot.com

www.ma-elibrary.blogspot.com

اتفاق سے اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ نرس کوئی دوا لانے کے لئے گئی تھی۔ اشتیاق گھر سے تکیوں میں سر ٹکائے لیٹا تھا اس کے دائیں بازو کی رگ میں سیلائین جا رہا تھا، دوسرا بازو اس کے سینے پر تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے سیاہ چہرے کے پیچھے سفید تکیوں سے پرے کھڑکی کی پلکوں پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے اور کانچ کی سطح پر روشنی اور سائے امید و بیم کی کشمکش طرح لرزاں تھے۔

اشتیاق: میں نے اسکے بستر کے قریب جا کر سرگوشی میں کہا: اشتیاق منظور میں نے پھر ذرا اونچی سرگوشی میں کہا: کان کھول کے سنو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے: نرس آرہی ہے:

اشتیاق نے آنکھیں کھولیں اور جب میں نے دیکھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے تو میں نے اس کے قریب جھک کر کہا: کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر تمہارے پاس بیان قلم بند کرنے کے لئے آجائے گا اس سے صرف یہ کہنا ہو گا کہ تمہارے پیٹ میں درد تھا اور تم امرت دھارا لے کر سو گئے تھے لیکن میرا اتفاق سے کچن میں تمہارے سرہانے ٹیک ٹونٹی کی شیشی بھی پڑی تھی وہ بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی امرت دھارا کی اس لئے رات کو جب تمہارے پیٹ کا درد بڑھا تو تم نے غلطی سے امرت دھارا کی بجائے ٹیک ٹونٹی پی لی غلطی سے پی لی۔ بس اور کچھ مت کہنا سمجھتے ہو:

اشتیاق نے میری طرف دیکھ کر خاموشی سے سر ہلا دیا، آنکھوں کی پتلیاں نیم ساکت، ہونٹ اندر بھنچے ہوئے رخساروں کے گڑھے گہری اور اداس تھاہ تاریکی میں کھوئے ہوئے۔ سینہ کھلا اور اجاڑ خشک بالوں سے ڈھکا ہوا۔ کسی ویران جزیرے کے مانند اور دبلی پتلی پسلیاں کسی شکستہ معبد کی سیڑھیوں کی طرح زندگی کے سوکھے تالاب کی طرف جاتی ہوئی۔

اشتیاق! اشتیاق تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے اس کے سر پر جھک کر پوچھا۔

اس کا چہرہ دیر تک بالکل ساکت رہا، جیسے اس نے میرا سوال نہ سنا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اس کے سینے پر سرکنے لگا دھیرے دھیرے وہ اپنا سینہ اپنی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ہوا کی سی سرگوشی میں بولا: سینہ خالی ہے:

سینہ خالی ہے۔ کتنی صدیوں سے انسان کا سینہ خالی ہے اور انسان کا یہ خالی سینہ رام نہ بھر سکے۔ مسیح نہ بھر سکے اور حسین نہ بھر سکے تو تم کیا بھر سکو گے احمق باورچی اور اس سینے کے اندر خوفناک گڑھے ہیں اور گہری کھائیاں کیسے کیسے بسیط خلا ہیں جن کے اندر تم کہاں سے کہاں کو لڑکھڑا کر ڈالتے رہے ہو تاکہ کسی طرح یہ خلا بھر جائے پہلے تو تم نے اس رسکتے ناب کو ... جھینٹ کا پھر ایک بلی کو دم سے باندھ کر اس میں اٹکا دیا، پھر سینکڑوں لپ جانے تم نے اس میں انڈیل دیئے اور ڈبل روٹیاں کاٹ کاٹ کر اس کے اندر پھینکتے رہے۔ تم میری توتھ پیسٹ بناتے رہے اور خود بے گھر رہ کر دوسروں کے لئے بے گھر ڈھونڈتے رہے اور اپنے بچوں کی مایوسی میں دوسروں کے بچوں سے محبت کرتے مگر تم گلشن کو کبھی بھول نہ سکے اور کسی طرح یہ خلا پُر نہ ہو سکا۔ گلشن گلشن تم کانٹے چنتے رہے اور بے قرار اور مضطرب ہو کر ایک پہیے سے دوسرے پہیے کی چکی میں گھستے رہے تاکہ کسی طرح تم وہ خلا بھر سکو۔ جسے صرف ایک عورت کی محبت بھر سکتی ہے ..... چگلے:

نرس اندر آگئی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اشتیاق کا خاموش ستا ہوا بدہیئت چہرہ دیکھا۔ تکیوں کے پیچھے بند کھڑکی کی پلکوں سے چند قطرے ہوا سے لرز کر ٹوٹے اور کانچ کے رخساروں پر بہتے ہوئے چلے گئے ...

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

www.angoothachaap.blogspot.com